خیالاتِ گاندھی

از

نرمل چندر

نغمات البلیغ

از

رنجور

فہرست

پیش لفظ

اس امر واقعہ کو بیان کرنے میں مجھے ذرا تامل نہیں۔ کہ مزاجی اختلاف کے باعث بعض امور میں میرا مہاتما گاندھی جی سے اختلاف چلا آتا ہے۔ دیانتدارانہ اختلاف ہر فرد و بشر کا پیدائشی حق ہے۔ اس بنیادی حق کو چھوڑنے کے معنی اس انفرادی یکتائی سے انکار ہوں گے۔ جو ترقی یافتہ زندگی کا مرکزی جوہر ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے اختلاف رائے کو دبانا قومی زندگی کے تعفن اور زوال میں منتج ہوا کرتا ہے۔

لیکن اختلاف رائے کے باوجود جب میں مہاتماجی کی شخصیت اور زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تب وجود کا ذرہ ذرہ مدحت سرائی کرنے لگتا ہے۔ آپ کی عظیم اور جادو اثر شخصیت نہ صرف موجودہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ بلکہ تاریخ انسانی میں بھی لاثانی ہے۔ اور اس کا ظہور صرف اہل ہند کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ نوع انسان کے لئے موجب فخر اور امید افزا ہے۔ اور اگر آپ کی زندگی کو دیکھا جائے۔ تو وہ کئی پہلوؤں سے انسانیت کا بلند ترین معیار پیش کرتی ہے۔ دنیا میں مہاپرشوں۔ گیانیوں۔ تپسیوں یوگیوں۔

بھگتوں۔ سنتوں۔ تیاگیوں۔ سیوکوں۔ ریفارمرز اور انقلاب پسندوں کا کوئی شمار نہیں ہے مگر مہاتما جی کی زندگی میں انسانی عظمت کے یہ تمام عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ ایک ہی زندگی میں اس درجہ کی سچائی۔ محبت۔ پاکیزگی۔ نیکی۔ بے خوفی۔ دلیری۔ حلم و عفو۔ انکسار و ترک۔ خلوص۔ استقلال۔ عقیدت۔ رواداری۔ اور بے غرضی کا پایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنی کوشش سے کیا کچھ ہو سکتا اور کر سکتا ہے۔ مہاتما جی کی زندگی واقعی طور پر ایک عملی تجربہ ہے۔ جو نہایت ہی قیمتی اور عملی اسباق سے پُر ہے۔

فلسفہ ہند کا دعوےٰ ہے۔ کہ انسان خود ہی روشنیوں کی روشنی ہے۔ مہاتما جی کا انتہائی انکسار شاید انہیں اس دعوے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر انہوں نے عملاً دکھلا دیا ہے۔ کہ انسان کے اندر یا پس پشت ایک غیر محدود چشمہ نور موجود ہے۔ جس سے وہ بالضرورت راہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس چشمہ کے ساتھ براہ راست تعلق کے ذریعے مہاتما جی نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی سادگی۔ پاکیزگی۔ اور صفا میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ زمانہ قریب اس خدائی ادب کی قدردانی میں حائل ہو رہا ہے۔ آئندہ نسلیں ہی اس کی ابدی قیمت کا صحیح تخمینہ کر سکیں گی۔ میں اس کی خاص اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں پاتا۔ کہ یہ "انسان کی سچی۔ اعلیٰ اور عملی زندگی کا ادب" ہے۔

"**خیالات گاندھی**" میں مہاتما جی کی اپنی تحریرات میں سے اقتباسات کے سوا کچھ نہیں دیا گیا۔ یہ اقتباسات دل و دماغ کے لئے نہایت مقوی غذا پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ہر قسم کے ادب سے حقیقی فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم اس کے خیالات کو محض عقیدت کے ماتحت قبول کر لینے کی بجائے ان کا کھلے دل اور تنقیدی عقل سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کے شخصی۔ مقامی اور وقتی عناصر کو اس کے غیر شخصی۔ عالمگیر اور ابدی عناصر سے تمیز کیا کریں۔ کیونکہ با تمیز انجذاب

ہی زندگی دے سکتا ہے۔ اگر اس شرط کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ تو بہترین ادب کا مطالعہ بھی حقیقی بیداری اور ترقی میں معاون ہونے کی بجائے اس میں سکون اور جمود کا موجب ہو جاتا ہے۔

یہاں پر اس امر کا اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے اس کتاب کی تالیف کرتے وقت مندرجہ ذیل دو کتابوں سے بہت مدد لی ہے۔

(۱) گاندھی سوترز۔ مصنفہ پرنسپل ڈی۔ ایس۔ شرما مطبوعہ جی۔ ایس۔ پریس مدراس اور (۲) دی مائینڈ آف مہاتما گاندھی مولفہ آر۔ کے۔ پربھو اینڈ یو۔ آر۔ راؤ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ میری رائے میں یہ ہر دو کتب وسیع ترین اشاعت اور مطالعہ کی مستحق ہیں۔ اگر گاندھی سوترز کو گاندھی درشن کہا جائے۔ تو عین بجا ہوگا۔ آخر الذکر کتاب کے مولفین نے اپنی قابل قدر تالیف سے انگریزی خواں دنیا کی بہترین خدمت کی ہے۔

اس اشد ضرورت کے احساس کے ماتحت کہ اہل ہند کو اگر سب زبانوں سے نہیں تو مسلمہ طور پر زمانہ حال کے سب سے بڑے رشی اور کرم یوگی کی تعلیمات سے نئی زندگی اور بیداری حاصل کرنی چاہئے۔ ہم ہندوستانی زبان میں مہاتما جی کے خیالات پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں۔ کہ اس خادمانہ کوشش سے فائدہ اٹھایا جائیگا۔

مولف و مترجم
نرمل چند
پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور
۳ر جولائی ۱۹۴۶ء

سچائی

ستیہ (سچائی) کا لفظ ست سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہستی (ہونا) ہیں۔ حقیقت میں سچائی کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستیہ کو پرماتما کا سب سے بڑا نام مانا گیا ہے۔ دراصل یہ کہنا کہ سچائی ہی خدا ہے۔ اس کہنے سے صحیح تر ہے کہ خدا سچائی ہے۔ چونکہ ہم ایک حاکم یا جرنل کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شہنشاہ یا قادر مطلق کی مانند خدا کے نام مروج رہیں گے۔ گہری سوچ بچار کرنے پر ہم دیکھ پائیں گے۔ کہ ست (سچائی) ہی ایشور کا وہ نام ہے۔ جو صحیح اور پُر معنی ہے۔

اور جہاں سچائی موجود ہوتی ہے۔ وہاں علم۔ پاک علم بھی پایا جاتا ہے جہاں سچائی نہیں ہے وہاں حقیقی علم بھی موجود نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ چیت یا علم کے لفظ کو بھی ایشور کے نام کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ اور جہاں صحیح علم ہوتا ہے۔ وہاں سدا مسرت پائی جاتی ہے۔ وہاں غم و الم کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ اور جس طرح سچائی ابدی ہے۔ اسی طرح اس سے حاصل ہونے والی مسرت (آنند) بھی ابدی ہے۔ اسی لئے ہم ایشور کو

ست ۔ چت ۔ آنند کہتے ہیں ۔ اس کی ذات میں سچائی ۔ علم اور سرور ملے جُلے پائے جاتے ہیں ۔

سچائی کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے ۔ مگر میں نے اسے اپنے لئے یہ کہہ کر حل کر لیا ہے کہ وہی سچائی ہے ۔ جو تمہاری اندرونی آواز تمہیں بتلاتی ہے ۔ اس پر تم سوال دریافت کر سکتے ہو کہ تب لوگ کیوں مختلف اور متضاد سچائیوں کے متعلق سوچا کرتے ہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسانی ذہن بے شمار وسیلوں سے کام کرتا ہے ۔ اور انسانی ذہن کا ارتقا سب لوگوں میں یکساں طور پر نہیں پایا جاتا ۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے ۔ کہ جو بات ایک کو سچی معلوم ہوتی ہے ۔ وہی دوسرے کو باطل دکھائی دیتی ہے ۔ اور اس لئے جن لوگوں نے یہ تجربات کئے ہیں ۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان تجربات سے بعض شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ چونکہ آجکل ہر شخص کسی قسم کے ضبط میں سے گذرے بغیر اپنی ضمیر کے حق کا مدعی ہو رہا ہے ۔ اس لئے اس حیران و پریشان دُنیا میں اس قدر جھوٹ کی اشاعت ہو رہی ہے ۔ میں اس بارہ میں نہایت انکسار کے ساتھ جو بات پیش کر سکتا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ وہ شخص سچائی کو پا ہی نہیں سکتا ۔ جو اپنے اندر افراط سے انکسار کی حس نہیں رکھتا ۔ اگر تم سمندر کے سینے پر تیرنا چاہتے ہو ۔ تب ضروری ہے ۔ کہ تم منکسر ہوتے ہوتے صفر ہی ہو جاؤ ۔

میری نظر میں سچائی وہ حقیقت مطلقہ ہے ۔ جو اور کئی حقائق کو اپنے اندر شامل کرتی ہے ۔ اس سچائی سے مراد صرف سچ بولنا ہی نہیں ۔ بلکہ خیال میں سچائی بھی مفہوم ہے اور صرف تصورات کی نسبتی سچائی ہی نہیں ۔ بلکہ وہ مطلق سچائی ۔ ابدی حقیقت ہے جسے خدا کا نام دیا جاتا ہے ۔ خدا کی بے شمار تعریفات موجود ہیں ۔ کیونکہ اس کے ظہورات کا کوئی شمار نہیں ہے ۔ یہ ظہورات مجھے حیرت اور ہیبت سے مغلوب کرتے ہوئے پل بھر کے لئے مسحور کر ڈالتے ہیں ۔ لیکن میں صرف ست (حق) کے طور پر ہی خدا کی عبادت کرتا ہوں ۔

اگرچہ میں اب تک اسے پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مگر اس کی تلاش میں ہوں۔ اور اس تلاش میں میں اپنی پیاری سے پیاری چیزوں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں تک کہ اگر اس غرض کے لئے میری جان بھی مجھ سے طلب کی جائے۔ تو مجھے امید ہے کہ میں اسے دینے کے لئے تیار پایا جاؤنگا۔ لیکن جب تک میں اس حقیقت مطلقہ کو نہ جان لوں۔ تب تک مجھے اسی اضافی سچائی کا قائل رہنا ہوگا۔ جو میں نے تصور کر رکھی ہے۔ وہ اضافی سچائی اس دوران میں میرے لئے روشن مینار۔ سپر اور چھوٹی ڈھال ہوگی۔ اگرچہ یہ راستہ استرے کی دھار کی مانند تنگ۔ محدود اور تیز ہے۔ مگر یہ نہایت ہی جلدی اور آسانی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف لے جانے والا ہے۔ مجھے اپنی ہمالہ کی مانند عظیم غلطیاں بھی ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ میں اس راستہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں سرکنا۔ اس راستہ نے مجھے المناک ہونے سے بچایا ہے۔ اور میں اپنی روشنی کے مطابق آگے بڑھتا چلا گیا ہوں۔ میں نے اپنی پیشروی میں اکثر اوقات حقیقت مطلقہ کا خدا کی جھلکیں دیکھ پائی ہیں۔ اور روز بروز میرا یہ یقین بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کہ صرف وہی ذات حقیقی ہے۔ باقی سب کچھ غیر حقیقی ہے۔ .... ایک اور یقین جو میرے اندر بڑھتا گیا ہے۔ یہ ہے کہ جو کچھ میرے لئے ممکن ہے۔ وہ ایک بچے کیلئے بھی ممکن ہے۔ اور میں ایسا کہنے کیلئے معقول وجوہات رکھتا ہوں۔ سچائی کی کھوج کے آلات ایسے ہی سادہ ہیں۔ جیسے کہ وہ مشکل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مغرور شخص کو نا ممکن دکھلائی دیں اور ایک معصوم بچے کو بالکل ممکن نظر آتے ہوں۔ سچائی کے طالب کو خاک سے بھی بڑھ کر منکسر بننا چاہئے۔ دُنیا خاک کو پاؤں تلے روندا کرتی ہے لیکن طالب حقیقت کو ایسا متواضع ہونا چاہئے۔ کہ خاک بھی اسے روند سکے۔ صرف تب ہی، اور اس سے پیشتر نہیں۔ وہ سچائی کی جھلک پانے کے قابل ہوگا۔"

"ستیہ کی جے ہو۔ خواہ میرے ایسے سینکڑوں اشخاص تلف ہو جائیں۔ میرے

ایسے غلط کار انسانوں کو پرکھتے وقت ہمیں سچائی کے معیار کو ایک بال بھر بھی نہیں گھٹانا چاہیئے۔"

" مجھے اپنے متعلق اندازہ لگاتے وقت سچائی کی مانند ایسا ہی سختگیر ہونا چاہیئے جیسا کہ مَیں دوسرے کے متعلق ہونا چاہتا ہوں۔ اس معیار سے ملپنے پر مَیں سورداس کی مانند یوں پکار اٹھوں گا۔"

میری مانند شریر، گھناؤنا کم بخت کون ہوگا؟

مَیں ایسا بے وفا ہوں کہ

مَیں نے اپنے پیدا کرنے والے کو ہی چھوڑ رکھا ہے۔

کیونکہ یہ بات میرے لئے لگاتار عذاب کا باعث ہو رہی ہے۔ کہ مَیں ابھی تک اس سے بہت دُور ہوں۔ جو جیسا کہ میں پورے طور پر جانتا ہوں۔ میری زندگی کے ہر ایک سانس پر حکمران ہے۔ اور مَیں اس کا بچہ ہوں۔ مَیں یہ جانتا ہوں کہ میرے اپنے بُرے جذبات ہی مجھے اس سے اس قدر دُور رکھتے ہیں۔ کہ مَیں ان سے پیچھا نہیں چھوڑا سکتا۔

میں اُس کوزہ گر کے ہاتھوں میں صرف ایک مٹی کا ڈھیلا ہوں۔ سچائی اور محبت یعنی اہنسا ہی زندگی میں قابلِ لحاظ ہیں۔ جہاں یہ موجود ہوں۔ وہاں ہر ایک شے انجام کار ٹھیک ہو جاتی ہے۔ یہ وہ قانون ہے جو کوئی استثنٰے نہیں رکھتا۔

میرے غیر متبدل تجربے نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ ستیہ (سچائی) کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ مَیں نے سچائی کی جو تھوڑی سی اور عارضی جھلکیں پائی ہیں۔ وہ سچائی کی اُس ناقابلِ بیان درخشانی کا تصور مشکل سے ہی دلا سکتی ہیں۔ جو اس سورج سے جسے ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے ہیں لاکھوں روشن تر ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ جو کچھ مَیں نے حاصل کیا ہے۔ وہ اس عظیم الشان تجلی کی

کی نہایت ہی دھندلی سی جھلک ہی ہے۔ لیکن میں اپنے تجربات کے نتیجہ کے طور پر یہ کہنے کے قابل ہوں۔ کہ اہنسا پر پوری طرح کاربند ہونے سے ہی حقیقت کا دیدار کامل نصیب ہو سکتا ہے۔

انسان ساری سچائی کو جاننے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اس کا فرض یہی ہے کہ وہ جس سچائی کو دیکھتا ہے۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ پاکیزہ ترین وسائل (عدم تشدد) کو استعمال کرے۔

سچائی ہر ایک انسانی دل میں موجود ہے۔ ہمیں وہیں اس کی تلاش کرنی ہوگی۔ اور جس قدر وہ نظر آئے۔ اس سے زندگی میں راہنمائی حاصل کرنی ہوگی۔ مگر کسی شخص کا کوئی حق نہیں ہے۔ کہ وہ دوسرے لوگوں کو سچائی کے بارہ میں اپنے تصور کے مطابق عمل کرنے کیلئے مجبور کرے۔

میں ایک عاجز مگر بہت سرگرم طالب حق ہوں۔ اور میں اپنی کھوج میں دوسرے تمام کھوجی ساتھیوں پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔ ان کی مدد سے اپنی غلطیوں کو جاننا اور دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میں نے اپنے جائزات و فیصلہ جات میں اکثر اوقات غلطی کی ہے...... اور چونکہ میں نے ہر حالت میں اپنے کئے کی تلافی کرنیکی کوشش کی ہے۔ اس لئے کوئی مستقل نقصان نہیں ہوا۔ بخلاف اس کے عدم تشدد کی بنیادی سچائی مجھ پر پہلے کی نسبت بے اندازہ درجے زیادہ روشن ہو گئی ہے۔ اور ملک کو کسی طرح سے بھی مستقل طور پر نقصان نہیں پہنچا۔

میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ جو میری دلی نیت کیخلاف ہو۔ میں فطرتاً سیدھا دل کی طرف جاتا ہوں۔ اور اگر میں موجودہ وقت میں ایسا کرنے میں اکثر اوقات ناکامیاب رہتا ہوں۔ تو میں جانتا ہوں کہ سچائی بالآخر سنی اور محسوس کی جائے گی۔ جیسی کہ یہ بات اکثر دفعہ میرے تجربے میں آچکی ہے۔

میں خود ہی سیکھنے والا ہوں۔ اور میں کوئی ذاتی اغراض نہیں رکھتا اور میں جہاں کہیں

سچائی دیکھ پاتا ہوں۔ اسے قبول کر کے اس پر عامل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

میری تحریرات میں جھوٹ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ میرا اٹل وشواس ہے۔ کہ سچائی کے سوا کوئی دھرم نہیں ہے۔ نیز میں اس ہر ایک بات جو سچائی کے بدلے حاصل کی گئی ہو۔ کو ترک کرنے کے قابل ہوں۔ میری تحریرات لازمی طور پر کسی فرد کے خلاف نفرت سے بالکل پاک ہیں۔ کیونکہ یہ میرا پختہ عقیدہ ہے۔ کہ زمین محبت کے سہارے قائم ہے۔ صرف وہیں زندگی پائی جاتی ہے۔ جہاں محبت موجود ہے۔ محبت اُسی سکے کا ہی ایک پہلو ہے۔ جس کا دوسرا اُلٹا پہلو سچائی ہے۔ محبت کے بغیر زندگی موت ہے۔ یہ میرا پکا یقین ہے .... کہ ہم سچائی اور محبت کے ذریعے ساری دُنیا کو جیت سکتے ہیں۔

میرا یقین ہے کہ اگر بہترین ارادوں کے باوجود کوئی شخص غلطیوں میں مبتلا ہو جائے تو وہ غلطیاں دُنیا یا اس شخص کے لئے نقصان کا باعث نہیں ہوتیں۔ خدا ہمیشہ دُنیا کو ان لوگوں کی بلا ارادہ غلطیوں کے نتائج سے بچایا کرتا ہے۔ جو اس سے ڈر کر جیتے ہیں۔ جو لوگ میری مثال دیکھ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اس حالت میں بھی گمراہ ہو جاتے۔ اگر وہ میرے عمل سے بالکل بے خبر ہوتے۔ کیونکہ آخری تحلیل میں انسان اپنے رویے میں اپنی اندرونی تحریکات سے متحرک ہوا کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات بیرونی مثال ان کی رہنما معلوم ہوتی ہو لیکن وجہ کچھ ہی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میری غلطیوں کے باعث دنیا کو کبھی کوئی گزند نہیں پہنچا۔ کیونکہ وہ سب کی سب میری جہالت کا نتیجہ تھیں۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ میری معلوم غلطیوں میں سے کوئی ایک بھی ارادی نہ تھی۔ زندگی ایک آرزو ہے۔ اس کا مقصد حصولِ کمال کیلئے جس کا دوسرا نام تکمیلِ ذات ہے کوشش کرنا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور نقصوں کی وجہ سے اس معیار کو نیچا نہ کریں۔ میں درد کے ساتھ اس امر کی آگاہی رکھتا ہوں کہ یہ دونوں باتیں میرے اندر موجود ہیں۔ ہر روز سچائی کے دیوتا میری یہی دلی پکار اٹھا کرتی ہے۔ کہ وہ مجھے اپنی کمزوریوں اور نقصوں کے دور کرنے میں میری مدد کرے۔

سچائی خدا ہے

میری نظر میں خدا سچائی اور محبت ہے۔ خدا علم اخلاق اور اخلاق ہے۔ خدا بے خوفی ہے۔ وہ روشنی اور زندگی کا چشمہ ہے۔ اور اس پر بھی وہ ان سب سے پرے ہے ملحد کا اِلحاد (ناستکتا) بھی وہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی غیر محدود محبت میں ملحد کو بھی جینے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ کلام اور عقل سے پرے ہے۔ وہ ہمارے دلوں کو ہماری نسبت بہتر جانتا ہے۔ وہ ہمارے الفاظ سے اندازہ نہیں لگاتا۔ کیونکہ ہم ہیں سے بعض باخبری اور بعض بے خبری میں اپنے الفاظ کے مطابق نیت نہیں رکھتے۔ وہ ان لوگوں کے لئے شخصی خدا ہے۔ جو اس کی شخصی حضوری کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور اُن کے لئے مجسم ہے جو اسے چھونا چاہتے ہیں۔ وہ پاکیزہ ترین ذات ہے۔ وہ عقیدت مند لوگوں کے لئے صرف ہے۔ وہ ہم میں ہے اور اس پر بھی ہم سے برتر اور پرے ہے۔ وہ سب لوگوں کیلئے سبھی کچھ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کانگرس سے خدا کے لفظ کو خارج ہی کردے۔ مگر وہ بذاتِ خود اس حقیقت کو باہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

ہماری زندگی صرف سچائی کی پیروی کے لئے ہے۔ اسی لئے ہمارے تمام اعمال سچائی میں مرکوز ہونے چاہئیں، یہاں تک کہ سچائی ہماری زندگی کا تنفس ہو جائے۔ جب راہِ حق کا مسافر ایک بار اس مرحلے پر رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ تب صحیح زندگی کے دیگر تمام قواعد بلا کوشش ہی عمل پذیر ہونے لگ جاتے ہیں۔ اور خود بخود ان کی اطاعت ہونے لگتی ہے۔ مگر اس کے بغیر زندگی میں کسی بھی اصول یا قواعد پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔

سچائی کے سوا میں اور کوئی خدا نہیں رکھتا جس کی میں خدمت کروں۔

میں سچائی کے سوا اور کسی شے کا عابد نہیں ہوں۔ اور نہ ہی سچائی کے بغیر کوئی اور شخص مجھ پر حکمرانی کا حق رکھتا ہے۔

ایک حقیر شخص ہونے پر بھی جب سچائی میری راہ سے بولتی ہے۔ تب میں ناقابل تسخیر ہو جاتا ہوں۔

میں خدا کو روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ خدا سچائی ہے۔ اور میرے لئے خدا کو جاننے کا یقینی طریقہ عدم تشدد۔ اہنسا اور محبت ہے۔

میں ہر روز اس قدر مصیبت اور دل شکنی دیکھتا ہوں۔ کہ اگر میں خدا کو اپنے اندر نہ دیکھ پاتا تو میں بھٹکتا ہوا پاگل ہو گیا ہوتا۔ اور ہٹ گئی میری منزل مقصود ہوتی۔

میں انسانی خدمت کی راہ سے خدا کو دیکھنے کی کوشش میں ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ خدا نہ تو آسمان میں ہے اور نہ زیرِ زمین۔ بلکہ ہر ایک کے اندر موجود ہے۔

میں نے خدا کو نہیں دیکھا۔ نہ ہی اسے جانا ہے۔ میں نے دنیا کے اس وشواس کو اپنا لیا ہے۔ جو وہ خدا میں رکھتی ہے۔ اور چونکہ میرا یقین امٹ ہے۔ میں اس یقین کو ہی تجربے کے برابر خیال کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ یقین کو تجربے کا نام دینا گویا سچائی کو نرم اور ملائم بنانا ہے۔ شاید یہ کہنا صحیح تر ہو گا۔ کہ میں

اپنی عقیدت کو بیان کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں رکھتا۔

مجھے صرف خدا کو اپنا رہنما بنا کر چلنا ہوگا۔ وہ بڑا غیرت مند مالک ہے۔ وہ اپنی حکومت میں اور کسی کو بھی شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے انسان کو اس کے رُوبرو اپنی ساری کمزوری کے ساتھ تہی دست اور پناہ گیر ہو کر حاضر ہونا ہوگا۔ تب ہی وہ تمہیں ساری دُنیا کے سامنے کھڑا ہونے کے قابل بنا کر ہر ایک ضرر اور گزند سے تمہاری حفاظت کرے گا۔

اوائل طفولیت میں مجھے ایشور کے ان ناموں کا رٹنا سکھلایا گیا تھا۔ جنہیں ہندو شاستروں میں اس کے ہزار نام (سہسر نام) کہا جاتا ہے۔ مگر ان ہزاروں ناموں پر بھی ایشور کے نام ختم نہیں ہو جاتے۔ ہم جانتے ہیں اور میرے خیال میں یہ سچ بھی ہے کہ ایشور اتنے ہی نام رکھتا ہے۔ جتنی کہ اس کی مخلوقات ہے۔ اور اس لئے ہم یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ وہ انام (بے اسم) ہے اور چونکہ وہ بے شمار صورتیں رکھتا ہے۔ اسی لئے اسے اروپ (بے صورت) کہا جاتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کئی بولیوں کی راہ سے بات کرتا ہے۔ اسی لئے ہم اسے اشبد کہتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ اور اس طرح جب میں نے اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ اسلام میں بھی خدا کے کئی نام پائے جاتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ جو کہتے تھے کہ خدا محبت ہے۔ میں خدا کو محبت کہتا تھا۔ مگر میں اپنے وجود میں گہرائی میں کہا کرتا تھا۔ کہ اگرچہ خدا محبت ہو سکتا ہے۔ مگر وہ سب سے بڑھ کر سچائی ہے۔ اگر میں انسانی زبان میں خدا کو پوری طرح بیان کر سکوں۔ تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ میرے لئے خدا سچائی ہے۔ مگر دو سال پیشتر میں نے اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر کہہ دیا تھا۔ کہ سچائی خدا ہے۔ آپ ان ہر دو بیانات کے درمیان لطیف فرق کو دیکھ پائیں گے۔ کہ خدا سچائی ہے اور سچائی خدا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر اُس لگاتار اور سخت کھوج کے ذریعے پہنچا ہوں۔

جو پچاس سال پیشتر شروع ہوئی تھی۔ تب میں نے جانا۔ کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ محبت ہے۔ لیکن میں نے یہ بھی دیکھا۔ کہ محبت کم از کم انگریزی زبان میں کئی معنی رکھتی ہے اور شہوت کے معنوں میں انسانی محبت گرانے والی شے بھی ہے۔ نیز میں نے دیکھا کہ اہنسا کے معنوں میں دُنیا میں بہت تھوڑے لوگ ہی محبت کے پیرو کار ہیں۔ مگر میں نے سچائی کو کبھی ذُو معنی نہیں پایا یہاں تک کہ ملحد لوگ بھی سچائی کی ضرورت اور طاقت سے منکر نہیں ہو سکتے۔ مگر سچائی دریافت کرنے کی سرگرم لگن میں ملحد لوگوں نے خود خدا کی ہستی سے انکار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ اور اپنے نقطہ نگاہ سے انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نے دیکھا۔ کہ یہ کہنے کی نسبت کہ خدا سچائی ہے مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ سچائی خدا ہے۔

ہم خدا کے تمام قوانین اور ان کے طریق عمل کو نہیں جانتے۔ بڑے سے بڑا سائنسدان اور ماہر سے ماہر عالم الارواح بھی خاک کے ذرے کی مانند ہے۔ اگر خدا میرے لئے میرے باپ کی مانند ایک شخصی وجود نہیں ہے۔ تو وہ اس سے بے اندازہ فائق تر ہے۔ وہ زندگی کی ادنےٰ سے ادنےٰ تفصیل میں بھی مجھ پر حکمران ہے۔ میں لفظاً اس بات کا قائل ہوں۔ کہ اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ ہر ایک سانس جو میں لیتا ہوں۔ اس کی منظوری پر انحصار رکھتا ہے۔

وہ اور اس کے قوانین ایک ہی بات ہیں۔ قانون خدا ہے۔ ہر ایک شے جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ صرف ایک صفت نہیں ہوتی۔ وہ خود ہی صفت ہے۔ وہ سچائی محبت۔ قانون اور وہ ہزاروں چیزیں ہے۔ جنہیں انسانی اختراع نام دے سکتی ہے۔

میں کل کا ایک اہم جزو ہوں۔ اور میں اسے نوع انسان سے الگ نہیں پا سکتا میرے ہموطن جو میرے قریب ترین ہمسائے ہیں۔ ایسے بیکس بے وسیلہ اور بے حس ہو

حرکت ہو رہے ہیں کہ ان کی خدمت میں اپنی ساری توجہ اور طاقت کا لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ اگر میں خود کو اس امر کے لئے آمادہ کر سکتا کہ میں اسے ہمالہ کی غاروں میں پاؤں۔ تب میں فوراً ادھر روانہ ہو گیا ہوتا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میں اسے نوع انسان سے الگ پا نہیں سکتا۔

اگر خدا کو بالکل ہی سائنٹیفک معنوں میں سمجھا جائے۔ تو وہ نیکی اور بدی دونوں کی تہ میں موجود ہے۔ وہ قاتل کے چھرے کی اسی طرح ہی راہنمائی کرتا ہے۔ جس طرح کہ سرجن کی چھری کی۔ مگر یہ سب نیکی اور بدی انسانی مقاصد کے لئے ایک دوسری سے جدا اور ناقابل اجتماع ہونے کے علاوہ روشنی اور تاریکی اور خدا اور شیطان کی طرف اشارہ دیتی ہیں۔

قوانین فطرت لاتغیر اور ناقابل تغیر ہیں۔ اور قوانین فطرت کی خلاف ورزی یا ان میں خلل اندازی کے معنوں میں کرامتیں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ مگر ہم محدود وجود رکھنے والے ہر قسم کی چیزوں کے تصور باندھا کرتے ہیں۔ اور اپنی حدود کو خدا کے ساتھ منسوب کرنے لگتے ہیں۔ ہم خدا کی نقل کر سکتے ہیں۔ مگر وہ ہماری نقل نہیں کر سکتا جب کہ اس کے لئے زمانہ ابدیت ہے۔ ہمارے لئے ماضی۔ حال اور مستقبل ہے اور انسان کی صد سالہ زندگی بھی زمانے ابدیت میں ایک قطرۂ محض سے بھی کمتر ہونے کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔

مجھے خدا کی ہستی اس سے بڑھ کر یقینی ہے کہ ہم (آپ اور تم) اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ نیز میں یہ شہادت بھی دے سکتا ہوں۔ کہ میں ہوا اور پانی کے بغیر تو جی سکتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ تم میری آنکھیں نکال لو۔ اور میری ناک کاٹ لو۔ مگر میں مروں گا نہیں۔ لیکن خدا پر سے میرا اعتقاد اٹھتے ہی میری موت ہو جائے گی۔ تم اسے وہم کہہ سکتے ہو۔ مگر یہ وہ وہم ہے۔ جسے میں اسی طرح ہی گلے لگائے

رکھتا ہوں۔ جس طرح کہ میں بچپن میں خوف وخطر کے وقت خدا کا نام جپا کرتا تھا۔ یہ بات مجھے ایک بوڑھی دایہ نے سکھلائی تھی۔

میرے ساتھ خط وکتابت کرنے والے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ میں معجزے دکھلانے کے قابل ہوں۔ مگر میں سچائی کے پجاری کے طور پر کہوں گا۔ کہ میں ایسی کوئی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ ساری طاقت جو مجھ میں پائی جاتی ہے۔ ایشور کی طرف سے آتی ہے۔ مگر وہ کبھی براہ راست عمل نہیں کرتا۔ وہ اپنے بے شمار آلات کی راہ سے کام کرتا ہے۔

میں دیکھتا اور یقین کرتا ہوں کہ خدا کبھی تمہارے روبرو شخصی طور پر نمودار نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس عمل میں جو ہماری تاریک ترین ساعت میں تمہارے چھٹکارے کا موجب ہوتا ہے۔

شخصی عبادت کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لگاتار اور ہماری بے خبری میں بھی برابر جاری رہتی ہے۔ کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے۔ جس میں میں اسی شاہد کی حضوری کو محسوس نہیں کرتا جس کی آنکھ سے کچھ چھپ نہیں سکتا۔ اور جس کے ساتھ میں ہمیشہ ہم آہنگ رہنا چاہتا ہوں۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مجھے اسکی طرف سے جواب نہ ملا ہو۔ میں نے جیل کی ان صبر آزما مصیبتوں میں اُسے اپنے قریب ترین پایا ہے۔ جبکہ افق تاریک ترین معلوم ہوتا تھا۔ اور راستہ پُر از دہشت دکھائی دیتا تھا۔ میں اپنی زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی یاد نہیں کر سکتا جبکہ میں نے یہ محسوس کیا ہو کہ خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔

میں اپنے لاکھوں ابنائے جنس کو جاننے کا دعوے کرتا ہوں۔ دن کے تمام اوقات میں میں ان کے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھے ان کا ہی سب سے پہلے اور آخر میں خیال رہتا ہے۔ کیوں کہ میں اس خدا کے سوا کسی اور خدا کو

کو نہیں مانتا۔ جو ان بے زبان لوگوں کے دلوں میں بستا ہے۔ وہ اس کی موجودگی کو نہیں جانتے۔ مگر میں جانتا ہوں۔ اور میں اس خدا کے سوا کسی اور خدا کی پرستش نہیں کرتا۔ جو سچائی ہے۔ یا وہ سچائی ہے۔ جو ان لاکھوں انسانوں کی خدمت کی بدولت ملتا ہے۔

سچائی اور خوبصورتی

اشیا کے دو پہلو ہیں۔ بیرونی اور اندرونی۔ ...... بیرونی پہلو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر وہ اندرونی پہلو کا معاون نہ ہو۔ اس طرح پر کل فن ہی روح کا اظہار ہے۔ بیرونی صورتیں صرف اُس حد تک معنی رکھتی ہیں۔ جہاں تک کہ وہ انسان کی باطنی روح کو ظاہر کرتی ہوں۔

کل سچے فن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذاتِ باطن کے جاننے میں روح کا مددگار ہو۔ میں اپنی حالت میں دیکھتا ہوں کہ میں روح کو جاننے کے لئے تمام بیرونی صورتوں کو ترک کر سکتا ہوں۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میں سچے معنوں میں تاثیر بخش فن موجود ہے۔ اگرچہ تم میرے اردگرد فنی صنائع نہ دیکھ پاؤ گے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے کمرے کی دیواریں کوری ہوں۔ اور شاید میں اپنے گھر کی چھت کو ہی ہٹا رہنے دوں۔ اس غرض سے کہ میں ان ستاروں بھرے آسمانوں کو دیکھ سکوں۔ جو خوبصورتی کی لامنتہا کشادگی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ کونسا انسان کا شعوری فن ہے۔ جو مجھے ان

مسلسل نظاروں سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔ جو اوپر جگمگاتے ہوئے ستاروں کے ساتھ آسمان کی طرف تکنے سے دکھلائی دیا کرتے ہیں؟ مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ میں اُن فنی پیداواروں کی قدر و قیمت سے منکر ہوں۔ جنہیں عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے۔ کہ میں شخصی طور پر انہیں جمال فطرت کی ابدی علامات کے روبرو کس قدر ناکافی خیال کرتا ہوں۔ انسانی فن کی پیداواریں صرف اسی حد تک قابل قدر ہیں۔ جہاں تک کہ وہ روح کو کشفِ ذات کی طرف آگے لے جاتی ہیں۔

ایک سچے صانع کو وہی چہرہ خوبصورت معلوم ہوا کرتا ہے۔ جو اپنی بیرونی صورت کے علاوہ روح کی اندرونی سچائی سے چمکتا ہو۔ سچائی سے الگ کوئی خوبصورتی نہیں ہے۔ دوسرے پہلو پر سچائی خود کو ایسی صورتوں میں ظاہر کر سکتی ہے۔ جو بیرونی طور پر کوئی خوبصورتی نہ رکھتی ہوں۔ سقراط کے متعلق ہم سنتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑھکر سچا انسان تھا۔ مگر اس کے نقش و نگار یونان میں سب سے بڑھ کر بدصورت مگر میری نظر میں وہ خوبصورت تھا۔ کیونکہ اس کی ساری زندگی سچائی کی تلاش میں گذری تھی۔ اور اس کی بیرونی صورت آرٹسٹ فِڈیاس کو جو بیرونی صورتوں میں بھی مشاہدہ جمال کا عادی تھا۔ اس میں سچائی کی خوبصورتی کی تعریف کرنے میں مانع نہ ہو سکی۔ میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔ جو خود کو صانع بتلاتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی انہیں ایسا مانتے ہیں۔ لیکن ان کے کاموں میں روح کی بیقراری یا اُوپر اُٹھنے کی تحریک کا مطلقاً کوئی نشان نہیں ملتا۔

میں سچائی میں اور سچائی کی راہ سے خوبصورتی کو دیکھتا اور پاتا ہوں۔ کل سچائیاں۔ نہ صرف سچے خیالات۔ بلکہ سچے چہرے۔ سچی تصویریں یا گیت بھی صحیح معنوں میں خوبصورت ہوتے ہیں۔ لوگ عام طور پر سچائی میں خوبصورتی نہیں دیکھ سکتے۔ عام

انسان سچائی سے بھاگتا ہوا اس کی خوبصورتی کی طرف سے اندھا رہتا ہے۔ جب لوگ سچائی میں خوبصورتی دیکھنا شروع کریں گے۔ تب ہی حقیقی فن نمودار ہوگا۔

انجام کار حقیقی خوبصورتی دل کی پاکیزگی میں پائی جاتی ہے۔

سچ اور جھوٹ اکثر اوقات بیک وقت موجود پائے جاتے ہیں۔ نیکی اور بدی بارہا اکٹھے دیکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح آرٹ میں بھی بسا اوقات اشیا کا صحیح اور غلط ادراک ایک ہی وقت میں موجود پایا جاتا ہے۔ جب صحیح ادراک عمل پذیر ہوتا ہے۔ تب ہی حقیقی طور پر خوبصورت تخلیقات نمودار ہوتی ہیں۔ اور جس طرح یہ ایسے لمحات زندگی میں شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح فن میں بھی کبھی کبھار دیکھے جاتے ہیں یہ خوبصورتیاں (غروب آفتاب یا ہلال جو بوقت شب ستاروں کے درمیان جگمگاتا ہے) اسی قدر ہی پُراز صداقت ہوتی ہیں۔ جس قدر کہ وہ مجھے اپنے پس پشت اپنے خالق کا خیال دلاتی ہیں۔ یہ چیزیں کس طرح خوبصورت ہوتیں۔ اگر کائنات کے مرکز میں سچائی موجود نہ ہوتی؟ جب میں غروب آفتاب کے اچنبھے یا چاند کی خوبصورتی کو بیان کرتا ہوں۔ میری روح خالق کی پرستش میں وسعت پذیر ہو جاتی ہے۔ میں ان تمام تخلیقات میں اُسے اور اس کی رحمتیں میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اگر غروب و طلوع آفتاب کے نظارے اس کے متعلق سوچنے میں معاون نہ ہوں تو وہ بھی صرف روکاوٹیں ہی ہوں گے۔ ہر ایک شے جو روح کے پرواز میں مانع ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کی مانند جو اکثر اوقات ہماری راہ نجات میں واقعی طور پر حائل ہو جاتا ہے۔ فریب نظر اور پھندا ہی ہے۔

میں وہ آرٹ اور ادب چاہتا ہوں۔ جو لاکھوں انسانوں (عام لوگوں) کے ساتھ مخاطب ہو سکے۔

سب سے پہلے سچائی کی تلاش کرنی چاہیئے۔ تب خوبصورتی اور نیکی خود بخود

حاصل ہو جائیں گی ۔ یہی بات ہے ۔ جو مسیح نے اپنے پہاڑی وعظ میں ہمیں سکھلائی ہے ۔ میری رائے میں مسیح نہایت اعلٰے درجے کا آرٹسٹ تھا ۔ کیونکہ اُس نے سچائی کو دیکھا اور بیان کیا ہے ۔ یہی حال محمدؐ کا ہے ۔ کیونکہ قرآن تمام عربی ادبیات میں مکمل ترین ادبی ترکیب ہے ۔ بہر حال ادبا ایسا کہتے ہیں ۔ چونکہ مسیح اور محمدؐ دونو نے ہی سب سے پہلے سچائی کو پانے کی کوشش کی ہے ۔ اس لئے اُن کے بیانات میں قدرتی طور پر اسی قدر خوبصورتی پائی جاتی ہے ۔ اگرچہ اُن میں سے کسی نے بھی آرٹ پر نہیں لکھا ۔ یہی سبب ہے کہ میں سچائی اور خوبصورتی کو چاہتا ہوا ان کے لئے جیتا ہوں ۔ اور ان کے لئے ہی مروں گا ۔

یہاں بھی ، جیسا کہ اور جگہ ، مجھے عوام کے نقطہ نگاہ سے سوچنا ہوگا ہم لاکھوں انسانوں کو اس طرح پر تربیت نہیں دے سکتے ۔ کہ وہ خوبصورتی کو اس طور سے دیکھنا سیکھیں کہ انہیں اس میں سچائی نظر آنے لگ جائے ۔ اُنہیں پہلے سچائی دکھلاؤ ۔ بعد ازاں وہ خوبصورتی دیکھنے لگ جائیں گے ۔ جو بات بھی بھوک سے مرتے ہوئے لاکھوں انسانوں کے لئے مفید ہو ۔ مجھے خوبصورت لگتی ہے ۔ آؤ آج ہم انہیں ضروریاتِ زندگی مہیا کریں ۔ زندگی کی آرائشات اور زیبائشات خود بخود نمودار ہو جائیں گی ۔

میں راگ اور دوسرے فنون کو عزیز رکھتا ہوں ۔ مگر میں انہیں وہ قدر و قیمت نہیں دیتا ۔ جو عام طور پر دی جاتی ہے ۔ مثلاً میں ان اشغال کی قدر و قیمت نہیں دیکھ پاتا ۔ جنہیں سمجھنے کے لئے فنی علم درکار ہوا کرتا ہے ۔ جب میں ستاروں سے جڑے ہوئے آسمان اور اُس غیر محدود جمال کو دیکھتا ہوں ۔ جو وہ میری آنکھوں کے روبرو پیش کرتا ہے ۔ تب میں اسی نظارے میں وہ کچھ پاتا ہوں ۔ جو کل انسانی فنون مجھے دے نہیں سکتے ۔ اس کے یہ معنے نہیں ۔ کہ میں ان پیداواروں

اور نمونوں کی قدر و قیمت سے منکر ہوں۔ جنہیں صنعتی کہا جاتا ہے لیکن شخصی طور پر میں جمالِ فطرت کے مقابلے میں ...... ان کے لیے حقیقت ہونے کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ زندگی کل فن سے عظیم تر ہے۔ بلکہ میں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہونگا۔ کہ جس شخص کی زندگی کمال کے قریب ترین ہے۔ وہی بڑے سے بڑا صانع (آرٹسٹ) ہے۔ کیوں کہ شریفانہ زندگی کی بنیاد اور چوکھٹے کے بغیر صرف فن بھلا کیا قدر و قیمت رکھ سکتا ہے؟

کل زندگی ایک ہے

میں خود کو اہنسا (عدم تشدد) سے تر بتر یقین کرتا ہوں۔ عدم تشدد اور سچائی میرے دو پھیپھڑے ہیں۔ میں ان کے بغیر جی نہیں سکتا۔ مگر میں ہر لمحہ اور بھی اور وضاحت کے ساتھ، عدم تشدد کی بے اندازہ طاقت اور انسان کی چھوٹائی کو دیکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ ایک بن باسی انسان بھی اپنی غیر محدود رحم دلی کے باوجود بھی تشدد سے بالکل خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر ایک سانس کے ساتھ کسی قدر تشدد کیا کرتا ہے۔ خود جسم ہی ایک قتل گاہ ہے۔ اور اس لئے جسم سے کامل مخلصی میں ہی موکش اور ابدی سرور پائے جاتے ہیں۔ اور اسی لئے موکش کے آنند کے سوا اور ہر قسم کی لذت عارضی اور ناقص ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں اپنی روزانہ زندگی میں تشدد کے کئی کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔

میں ایک لمحہ کے لئے بھی ایک کتے یا اور کسی جاندار کو آہستہ آہستہ عذاب سے بیکسی کے ساتھ تڑپتے ہوئے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ایسی حالت

میں ایک انسانی وجود کو نہیں مارونگا۔ کیونکہ اس کے لئے اور امید افزا ادویات موجود ہیں۔ مگر ایسی حالت میں میں ایک کتے کو ماردوں گا۔ کیونکہ میں اس کیلئے کوئی دوا نہیں رکھتا۔ اگر میرا بچہ ہڑک میں مبتلا ہو جائے اور مجھے اس کی جانکنی کے لئے کوئی دوا دکھلائی نہ دے۔ تب میں اس کی جان لینا اپنا فرض خیال کرونگا۔ تقدیر بھی اپنی حد مقرر رکھتی ہے۔ تمام ادویات کے ناکامیاب رہنے پر ہم اشیاء کو تقدیر کے حوالے کردیا کرتے ہیں۔ عذاب میں مبتلا بچے کی نزع کی واحد اور آخری تدبیر اس کی جان لینا ہی ہے۔

میرا اخلاق مجھے صرف اس امر کا دعوے ہی نہیں بلکہ تقاضا کرنیکی اجازت دیتا ہے۔ کہ میں نہ صرف بندر کا ... بلکہ گھوڑے۔ بھیڑ۔ شیر ببر۔ چیتے۔ سانپ اور بچھو کا بھی رشتہ دار ہوں۔ (ان رشتہ داروں کو اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خود کو ہمارے رشتہ دار خیال کریں) وہ سخت گیر اخلاق جو میری زندگی کا ناظم ہے اور جو میری رائے میں ہر مرد اور عورت کا ضابطہ ہونا چاہیئے۔ ہم پر یہ یک طرفہ فرض عائد کرتا ہے۔ اور یہ فرض ہم پر اس لئے عائد کیا گیا ہے۔ کہ انسان خدا کے نمونے پر وضع ہوا ہے۔ اس امر واقعہ سے کہ ہم میں سے بعض ہماری اس حیثیت کے قائل نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کوئی فرق نہیں آتا کہ ہم اسی حالت میں اپنے اس مرتبے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جب ایک شیر ببر بھیڑوں کے درمیان پرورش ... پا کر اپنی حیثیت سے بے خبر رہتا ہوا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر تو بھی وہ اس وجہ سے اپنی حیثیت کھو نہیں بیٹھتا۔ کیونکہ جونہی وہ جان لیتا ہے۔ کہ وہ شیر ببر ہے۔ وہ بھیڑوں پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ مگر شیر ببر کا بھیس بدلنے والی بھیڑ اس مرتبہ کو حاصل نہیں کر سکتی۔ اور اس امر کے ثبوت کے لئے کہ انسان کو خدا کے نمونے پر وضع کیا گیا ہے

یہ دکھلانا ضروری نہ ہوگا۔ کہ تمام افراد انسانی اپنی شخصیتوں میں ایزدی صورت کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ صرف اس قدر دکھلانا ہی کافی ہوگا۔ کہ کم از کم ایک فرد بشر نے اپنے اندر ایزدی صورت کو ظاہر کیا ہے۔ اور کیا اس امر سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ کہ نوع انسان کے تمام مذہبی رہبروں نے اپنی شخصیتوں میں ایزدی صورت کا اظہار کیا ہے؟

میں سانپ کی زندگی کے بدلے بھی جینا نہیں چاہتا۔ میں اسے مارنے پر اس امر کو ترجیح دونگا۔ کہ وہ مجھے ڈس کر مار ڈالے۔ مگر بہت ممکن ہے کہ اگر خدا مجھے اس سخت امتحان میں ڈالتا ہوا سانپ کو مجھ پر حملہ آور ہونے کی اجازت دیدے۔ اور جان دے دینے کی جرأت رکھنے کی بجائے میرا اندرونی حیوان مقابلے پر اتر آئے۔ اور میں اپنے فانی جسم کو بچانے کی غرض سے سانپ کو مار ڈالوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے عقیدہ میری زندگی میں اس قدر واقفیت پذیر نہیں ہو سکا کہ میں زور کے ساتھ یہ بات کہہ سکوں۔ کہ میرے دل سے سانپوں کا تمام خوف دُور ہو گیا ہے۔ اور میں سانپوں کو اسی طرح ہی دوست بنا سکتا ہوں۔ جیسا کہ چاہتا ہوں۔ یہ میرا کامل عقیدہ ہے کہ سانپ شیر وغیرہ ہمارے ان زہریلے، شریرانہ اور بُرے خیالات کا خدائی جواب ہیں۔ جو ہم اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ .... میرا یقین ہے کہ کل زندگی ایک ہے۔ خیالات متشخص صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ سانپ اور شیر ہمارے رشتہ دار ہیں۔ وہ ہمیں بُرے۔ شریرانہ اور شہوت پرستانہ خیالات سوچنے سے متنبہ کرتے ہیں۔ اگر میں بھی زمین کو زہریلے حیوانات اور مگرمچھوں سے پاک کرنا چاہوں۔ تو ضروری ہوگا۔ کہ میں خود کبھی زہریلے خیالات سے پاک کروں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکونگا۔ اگر میں اپنی بے صبر جہالت اور جسمانی

زندگی کو طوالت دینے کی خواہش کے بس میں نام نہاد زہریلے جانوروں اور مگرمچھوں کو مارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میں ان ضرر رساں جانداروں کے خلاف اپنی حفاظت کا خیال چھوڑ کر مر جاؤں۔ تب میں پھر بہتر اور کامل تر انسان کی صورت میں نمودار ہوگا۔ اس عقیدہ کو رکھتا ہوا بھلا میں سانپ کی صورت میں ہم بُود کو کیسے مار سکتا ہوں؟

کل جسمانی زندگی ہنسا (تشدد) کے سہارے وجود رکھتی ہے۔ اس لئے اعلےٰ ترین مذہب کو اہنسا (عدم تشدد) کے منفی لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ دُنیا تباہی کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ جسمانی زندگی کی ایک لازمی شرط ہے اسی لئے اہنسا کا پیروکار ہمیشہ خدا سے جسم سے انتہائی طور پہ نجات پانے کے لئے دعا مانگا کرتا ہے۔

میں درد کے ساتھ اس امر کی آگاہی رکھتا ہوں کہ جسمانی طور پہ زندہ رہنے کی خواہش ہی مجھے لگاتار ہنسا کا مرتکب کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے جسم سے میری اُداسی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً میں جانتا ہوں۔ کہ میں سانس لینے کے عمل میں ہوا میں اُڑتے ہوئے بے شمار غیر مرئی جراثیم کو مارتا ہوں۔ سبزی ترکاری کے کھانے میں بھی ہنسا پائی جاتی ہے۔ لیکن میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ نیز عفونت رُبا چیزوں کے استعمال میں بھی اہنسا پائی جاتی ہے۔ لیکن میں خود کو مچھروں کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لئے دافع عفونت اشیاء کے استعمال کو چھوڑ نہیں سکتا۔ میں اسی حالت میں سانپوں کے آشرم میں مارے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ کہ جب ان کا پکڑنا اور ان کے ضرر سے بچنا مشکل ہو۔ میں آشرم میں بیلوں کو چلانے کے لئے چھڑی کے استعمال کو برداشت کر لیتا ہوں۔ اس طرح ہر میری بالواسطہ یا بلا واسطہ اہنسا کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ اگر میرے اس منکسرانہ اعتراف کی وجہ سے دوست مجھے گیا گذرا جان کر مجھے چھوڑ دیں۔ تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا۔ مگر کوئی بات بھی مجھے اپنے ان نقائص کے چھپانے

کی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ جو بھی اہنسا کو عمل میں لاتے وقت خود میں پاتا ہوں۔ مَیں صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ مَیں اہنسا کی مانند عظیم آدرش کے مفہومات کو سمجھنے کے لئے لگاتار کوشاں ہوں۔ اور جیسا کہ میرا خیال ہے کہ میں خیال، لفظ اور عمل میں انہیں استعمال کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہوتا ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اسی سمت میں ابھی طویل سفر میرے درپیش ہے۔

مَیں ایک گائے کو بچانے کے لئے ایک انسان کو نہیں مارونگا اور نہ ہی کسی انسانی زندگی کو بچانے کے لئے گائے کو مار ڈالوں گا۔ خواہ انسانی زندگی کتنی ہی قیمتی ہو۔ کسی بھی مشکل میں کسی زندگی کے برباد ہونے کے خلاف میری عقل بغاوت کرتی ہے۔ مگر میرا دل اس قدر مضبوط نہیں ہے کہ اُن جانداروں کے ساتھ رشتہ رفاقت قایم کر سکے۔ جنہیں تجربہ تباہ کن بتلاتا ہے۔ اور مَیں یقین دلانے والے اعتماد کی وہ زبان نہیں رکھ سکتا۔ جو واقعی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ کمی اس وقت تک برابر موجود رہے گی۔ جب تک کہ میں سانپوں، شیروں اور ان کی مانند دیگر جاندارو سے خائف رہتا ہوں۔

زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ

مَیں سائنس کی ترقی کے خلاف نہیں ہوں بلکہ اس کے برعکس میں مغربی سائنس کا مداح ہوں۔ اور اگر میری یہ مدحت سرائی مشروط ہے۔ تو صرف اسی وجہ سے کہ مغرب کے اہل سائنس خدا کی ادنٰے مخلوق کا ذرا لحاظ نہیں رکھتے۔ میں اپنی ساری روح کے ساتھ زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے سائنس اور انسانیت کے نام پر معصوم زندگی کا ناقابل معافی قتل سخت ناپسند ہے۔ اور مَیں ان تمام عملی دریافتوں کو جو معصوم خون سے آلودہ ہیں۔ محض بے سود خیال کرتا ہوں۔ اگر زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کے بغیر دورانِ خون کا عمل دریافت نہیں ہو سکتا تھا۔ تب نوعِ انسان

اسی دریافت کے بغیر بھی گذارہ کر سکتی تھی۔ اور میں صاف طور پر اسی دن کو طلوع ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ جب کہ مغرب کا دیانت دار سائنس دان عملی تحقیقات کے موجودہ طریقوں پر بھی حد لگائیگا۔ آئندہ پیمائشات نہ صرف انسانی کینسر کے لئے بلکہ کل زندگی کے لئے برتی جائیں گی۔ اور جیسا کہ ہم بتدریج مگر یقینی طور پر جاننے لگے ہیں۔ کہ یہ خیال غلط ہے۔ کہ ہندو لوگ اپنی آبادی کے پانچویں حصے کے تنزل پر فروغ پا سکتے ہیں۔ یا مغرب مشرقی اور افریقہ کی اقوام کی لوٹ کھسوٹ کے سہارے جی سکتا ہے اسی طرح ہم آئندہ زمانے میں جان لیں گے۔ کہ ادنےٰ مخلوق پر ہماری حکومت ان کے قتل کی بجائے اپنے ساتھ ان کی بھلائی کے لئے ہے کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی میری مانند ہی روح رکھتے ہیں۔

عدم تشدد (اہنسا)

عدم تشدد ایک مکمل حالت ہے۔ یہ وہ منزل مقصود ہے جس کی طرف کل نوع انسان بے خبری میں حرکت پذیر ہو رہی ہے۔ انسان صرف اسی حالت میں ہی دیوتا کی مانند ہوتا ہے۔ جب کہ وہ مجسم معصومیت ہو جائے۔ اور تب ہی وہ سچے معنوں میں انسان کہلا سکتا ہے۔ موجودہ حالت میں ہم جزوی طور پر انسان اور جزوی طور پر حیوان ہیں۔ اور ہم اپنی بہ حالت جہالت بلکہ غرور میں ہم کہا کرتے ہیں کہ جب ہم تھپڑ کے بدلے تھپڑ لگانے کی غرض سے غصے کو کافی نشوونما دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ تب ہی ہماری نوع کا اصلی مقصد پورا ہوتا ہے۔ ہم یہ یقین ظاہر کرتے ہیں۔ کہ بدلا لینا ہمارا قانونِ ہستی ہے۔ حالانکہ ہم ہر ایک مقدس کتاب میں دیکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ انتقام کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر اسے لازمی قرار نہیں دیا گیا جبات لازمی ہے۔ وہ خود ضبطی ہے۔ انتقام ایک لطف اندوزانہ عملی ہے۔ جو پُر محنت انضباط چاہتا ہے۔ ہمارا قانونِ ہستی خود ضبطی ہے۔ اعلےٰ ترین خود ضبطی

کے بغیر اعلیٰ ترین کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس دُکھ سہنا انسانی قبیلے کی علامت ہے۔

دُنیا پُر از تشدد ہے۔ فطرت کے دانت اور پنجے خون سے رنگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مگر ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ انسان حیوان پر فضیلت رکھتا ہے۔ تو کیا انسان اُس فطرت سے اعلیٰ تر نہیں ہے؟ اگر انسان کوئی ایزدی مقصد رکھتا ہے۔ اور اگر وہ مقصد۔ جو اس کی شان کے شایاں ہے۔ تو وہ اہنسا (عدم تشدد) ہے۔ وہ جیسا کہ ہنسا سے بھرپور دُنیا کے درمیان کھڑا ہے۔ اپنے دل کی اندرون ترین گہرائیوں میں خلوت گزیں ہو کر دُنیا کے روبرو اعلان کر سکتا ہے۔ کہ اس پُر تشدد دُنیا میں اس کا کام اہنسا (عدم تشدد) ہے اور وہ جس قدر اہنسا کو عمل میں لاتا ہے۔ اُسی قدر ہی وہ اپنی نوع کے لئے موجب زینت ہوتا ہے۔ پس انسانی فطرت ہنسا نہیں۔ بلکہ اہنسا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اندرون ترین عقیدے کے ساتھ اپنے اس تجربے کا اعلان کر سکتا ہے کہ وہ جسم نہیں ہے بلکہ آتما ہے۔ اور وہ کشف ذات اور خود اظہاری کی خاطر ہی جسم کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اور اسی تجربے سے ہی وہ خواہش۔ غصے۔ جہالت۔ بخل اور دیگر جذبات کو مغلوب کر کے اخلاق کو نشوونما دیتا ہوا اپنے انتہائی مقصد کے حصول کے لئے کوشش میں بالآخر پوری کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مگر صرف اسی حالت میں جب کہ اس کی مساعی اس کمال کے مطابق عمل گیا ہے۔ اس لئے جذبات پر غلبہ پانا کوئی فوق البشری چیز نہیں بلکہ ایک انسانی صفت ہے۔ اہنسا پر کاربند ہونا وہ اعلیٰ ترین شجاعت ہے۔ جس کے اندر بزدلی یا کمزوری کے دخل کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مَیں عدم تشدد اور اس کے امکانات کا عِلمی صحت کے ساتھ پچاس سال سے بھی زیادہ عرصے سے عمل میں لا رہا ہوں۔ مَیں نے اسے زندگی کے ہر شعبے۔ خانگی۔ اِداراتی۔ اقتصادی اور سیاسی میں استعمال کر کے دیکھا ہے۔ مَیں نے کسی ایک

مثال میں بھی اسے ناکامیاب نہیں پایا۔ اور جب کبھی مجھے یہ اصول ناکامیاب ہوتا ہوا معلوم ہوا ہے۔ میں نے اس ناکامیابی کو اپنے نقائص کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ میں اپنے لئے کمال کا کوئی دعوےٰ نہیں رکھتا۔ مگر میں سچائی کا جو خدا کا دوسرا نام ہے سرگرم طالب ہونے کا مدعی ہوں۔ اسی طلب اور کھوج کے دوران میں عدم تشدد کی دریافت میرے ہاتھ لگ گئی۔ اب اس کی اشاعت ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کے سوا زندگی میں اور کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

عدم تشدد ایک ایسا ہتھیار ہے جو بے نظیر طاقت رکھتا ہے۔ یہ زندگی کی بڑی سے بڑی نعمت ہے۔ یہ بہادروں کی صفت ہے۔ درحقیقت یہی ان کا سب کچھ ہے۔ یہ بزدلوں کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی بے لوچ یا مردہ مسئلہ ہونے کی بجائے ایک زندہ اور زندگی بخش طاقت ہے۔ یہ روح کی صفت خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہنسا کو پرم دھرم دبرترین قانون کہا گیا ہے۔ اس لئے اسے معلم اہنسا کے ہاتھوں میں اس پاکیزہ ترین محبت کی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ جو سدا تازہ اور ہر عمل میں نمودار ہونے والی زندگی کا سدا اچھلتا ہوا سرچشمہ ہے۔ بددلی اس کے روبرو ٹک نہیں سکتی۔ اہنسا کا سورج۔ نفرت۔ غضب اور بددلی کی مانند تاریکی کے تمام ابنوہوں کو اپنے آگے بہالے جاتا ہے۔

میں خیال پرست ہونے کی بجائے عملی عملیت پسند ہونے کا مدعی ہوں۔ عدم تشدد کا مذہب صرف رشیوں اور سنتوں کے لئے نہیں ہے۔ یہ عوام الناس کے لئے بھی ہے۔ جس طرح حیوانی زندگی کا قانون تشدد ہے۔ اسی طرح ہی نوع انسان کا قانونِ زندگی عدم تشدد ہے۔ حیوان جسمانی طاقت کے سوا اور کسی قانون کو نہیں جانتا۔ انسانی شان روح کی تقویت کے لئے ایک برتر قانون کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی لئے میں نے اہل ہند کے روبرو خود ایثاری کا قدیم قانون پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔

بہتیروں نے سر ہلاتے ہوئے مجھے کہا ہے۔ "لیکن آپ عوام الناس کو اس قانون کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ یہ صرف افراد کے لئے ہی ممکن العمل ہے۔ اور وہ بھی شاذ و نادر صورتوں میں۔" میری رائے میں یہ ایک کیشف خود فریبی ہے۔ اگر نوع انسان عادتاً غیر متشدد نہ ہوتی۔ تو زمانوں پیشتر یہ خود بخود ہی ختم ہو گئی ہوتی۔ لیکن تشدد اور عدم تشدد کے باہمی مقابلے میں انجام کار عدم تشدد کی مجیت ہوتی چلی آئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس قدر صبر نہیں رکھتے۔ کہ پورے دل سے لوگوں میں سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے وسیع طور پر عدم تشدد کی اشاعت کرتے ہوئے نتائج کے منتظر رہ سکیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اس بات کو اچھی طرح جان لے۔ کہ وہ ایک غیر فانی روح رکھتا ہے۔ اور وہ ہر ایک جسمانی کمزوری پر فاتح ہو کر ساری دنیا کے جسمانی اجتماع کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اگر ہندوستان تلوار کے عقیدے کو قبول کر لے۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ عارضی فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس حالت میں ہندوستان میرے دل کے لئے قابل فخر نہ ہو گا۔ میں ہندوستان کے ساتھ اس لئے معتقد ہوں کہ میں نے سب کچھ ہندوستان سے پایا ہے۔ مجھے اس امر کا پورا الیقین ہے کہ ہندوستان دنیا کے لئے ایک مشن رکھتا ہے۔ وہ یورپ کی اندھا دھند نقل کرنے کے لئے نہیں ہے۔ اگر ہندوستان تلوار کے عقیدے کو قبول کر لے تو وہ میرے لئے آزمائش کی گھڑی ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ میں امتحان میں پورا اترونگا۔ میرا مذہب کوئی جغرافیائی حدود نہیں رکھتا۔ اگر میں اس میں زندہ عقیدت رکھتا ہوں۔ تو یہ عقیدت ہندوستان کے لئے میری محبت سے بھی پرے گزر جائے گی۔ میری زندگی عدم تشدد کے مذہب کے ذریعے ہندوستان کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔

میری ابتک زندگی میں ایک سے زیادہ ایسے مواقع پیش آ چکے ہیں کہ جب میں

بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود ایسا کرنے سے باز رہا ہوں۔ اور اپنے دوستوں کو بھی ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میری زندگی عدم تشدد کی اشاعت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ میں زردشت، مہابیر، ڈینی ایل۔ مسیح۔ محمد۔ نانک اور دیگر کثیر التعداد عظیم ترین معلمین کی تعلیمات میں عدم تشدد کی تعلیم پاتا ہوں۔

عدم تشدد میرے مذہب کا پہلا اور آخری اصول ہے۔ میں ایک بہادر اور صاحب ایثار انقلاب پسند کے روبرو سیدھا کھڑا ہونے سے نہیں شرماتا۔ کیونکہ میں اس کے مقابلے میں مساوی مقدار میں غیر متشدد انسان کی وہ بہادری اور خود ایثاری پیش کرنے کے قابل ہوں۔ جو معصوم خون کی آلودگی نہیں رکھتی ہے۔ ایک معصوم انسان کی قربانی ان لاکھوں انسانوں کی قربانی سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ جو دوسروں کو مارنے کی کوشش میں خود مر جاتے ہیں۔ معصوم انسان کی رضامندانہ قربانی مغرور ظلم کا وہ نہایت ہی زبردست جواب ہے۔ جو آج تک خدا یا انسان کے تصور میں آ سکا ہے۔

میرا مقصد زندگی مثال و وعظ کے ذریعے کڑی خود ضبطی کے ماتحت لوگوں کو ستیاگرہ کے اس بے نظیر اوزار کا استعمال سکھلانا ہے۔ جو عدم تشدد اور سچائی کا بلاواسطہ ضمنی نتیجہ ہے۔ میں یہ ثابت کرنے کے لئے نہ صرف بیقرار بلکہ درحقیقت بے صبر ہو رہا ہوں۔ کہ زندگی کی کثیر التعداد برائیوں کے لئے عدم تشدد کے سوا اور کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ جب میں برے خیالات سوچنے کے لئے نا قابل ہو جاتا ہوں۔ اور جب میرے خیالات کی دنیا میں، خواہ عارضی طور پر ہی کوئی بھی کرخت اور مغرور شئے نہیں رہے گی۔ تب ہی، اس سے پہلے نہیں، عدم تشدد دنیا بھر کے دلوں پر اثر انداز ہو سکیگا۔ میں نے اپنے یا قاری کے روبرو کوئی ناممکن العمل معیار یا صعب آزمائش پیش نہیں کی۔ یہ انسان کا فطری حق یا اختیار ہے۔ ہم نے

بہشت کو صرف اس لئے کھویا ہے۔ کہ اسے از سرِ نو حاصل کریں۔ اگر اس میں وقت لگتا ہے۔ تو یہ وقت مکمل دائرہ زمانی کے اندر نقطۂ محض ہے۔ گیتا کا ایزدی معلم اس بات کو خوب جانتا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ ہمارے لاکھوں دن برہم کے صرف ایک دن کے برابر ہیں۔

میری تبلیغ و تعلیم صرف جذباتی یا غیر عملی نہیں ہے۔ کیونکہ میں وہی بات سکھلاتا ہوں۔ جو قدیم ہے۔ اور جو کچھ دوسروں کو سکھلاتا ہوں۔ اس پر خود عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور میرا دعوٰے ہے کہ جس بات پر میں عمل کر رہا ہوں اسے سبھی عمل میں لا سکتے ہیں۔ کیونکہ میں ایک بالکل معمولی انسان ہوں۔ اور میں بھی ان تمام ترغیبات اور کمزوریوں سے مغلوب ہو سکتا ہوں۔ جن سے ہمارے درمیان بہترین افراد مغلوب ہو سکتے ہیں۔

میں اپنی ساری عمر قمار باز رہا ہوں۔ میں نے سچائی کے لئے اشتیاق اور عدم تشدد میں اپنی عقیدت کی بے دردانہ پیروی میں میں نے کسی داؤ کو بھی حد سے بڑا خیال نہیں کیا۔ اگر ایسا کرنے میں میں نے کبھی غلطی بھی کی ہو۔ تو میں ہر زمانہ و ملک کے نہایت عظیم سائنس دانوں کا ساتھی ہوں۔

یہ میرا اٹل یقین ہے کہ ہندوستان کی شدنی نوع انسان کو عدم تشدد کا پیغام دینا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات کی پھلتا میں زمانے گذر جائیں۔ مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے کوئی اور ملک اس کام کے کرنے میں ہندوستان سے پیش رو نہ ہو سکیگا۔

"گاندھی جی کا مذہب" کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اور میں اپنے پیچھے کوئی مذہبی فرقہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میرا کوئی دعوٰے نہیں ہے کہ میں نے دنیا میں کوئی نیا اصول یا عقیدہ دریافت کیا ہے۔ میں نے صرف اپنے طریق پر روزانہ زندگی اور اس کے معاملات پر ابدی اصول کو لاگو کرنے کا جتن کیا ہے۔ . . . . میرے پاس دنیا کو سکھلانے

کی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سچائی اور عدم تشدد پہاڑوں کی مانند قدیم ہیں۔ میں نے حتی الامکان وسیع پیمانے پر ان دونوں میں تجربات کرنے کی کوشش ہی کی ہے ایسا کرتے ہوئے میں نے بعض اوقات غلطی کی ہے۔ اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھا ہے۔ اس طرح پر زندگی اور اس کے سوالات میرے لئے سچائی اور عدم تشدد پر عمل درآمد کے تجربات ہو گئے ہیں۔ جبلی طور پر میں سچا تو ہوں مگر غیر متشدد نہیں ہوں۔ جیسا کہ ایک جین منی نے ایک بار کہا تھا کہ میں اہنسا کا پیرو کار اس قدر نہیں ہوں جس قدر کہ سچائی کا ہوں۔ میں سچائی کو پہلا اور اہنسا کو دوسرا درجہ دیتا ہوں۔ کیونکہ جیسا کہ اس نے بیان کیا تھا۔ میں سچائی کی خاطر اہنسا کو قربان کر سکتا ہوں۔ اور در حقیقت سچائی کی تلاش کے دوران ہی مجھ پر عدم تشدد کی حقیقت منکشف ہوئی ہے۔

میرا تجربہ جو دن بدن مضبوط تر اور عمیق تر ہوتا چلا جا رہا ہے مجھے بتلاتا ہے کہ سچائی اور عدم تشدد پر اس انتہائی حد تک کاربند ہوئے بغیر جہاں تک کہ انسان کے لئے جانا ممکن ہے افراد اور اقوام کے لئے کوئی امن نہیں ہے۔ انتقام کی حکمت عملی کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔

عدم تشدد کے لئے میری محبت دنیا اور عالم علوی کی ہر ایک شے پر فوقیت رکھتی ہے۔ صرف سچائی کے لئے میری محبت ہی اس کی برابری کر سکتی ہے۔ میری نظر میں یہ محبت اس عدم تشدد کی مترادف ہے جس کے وسیلہ سے ہی میں سچائی کو دیکھ اور پا سکتا ہوں۔ میری زندگی کا ڈھانچہ کہ جس طرح ہندوستان میں مختلف مذاہب کے درمیان امتیاز کی لکیر نہیں کھینچتا۔ اسی طرح وہ مختلف نسلوں کے درمیان بھی کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ میرے لئے ہر ایک انسان انسان ہے۔

میں ارادتاً کسی جاندار کو ایذا نہیں پہنچا سکتا۔ ابنائے جنس کا تو ذکر ہی کیا۔

اگرچہ جائز مجھے اور میرے متعلقین کو زیادہ سے زیادہ گزند پہنچانے والا ہو۔
میری تمنا محدود ہے۔ خدا نے مجھے عدم تشدد کی راہ میں دنیا کی راہنمائی کرنے کی طاقت نہیں دی۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں۔ کہ اس نے ہندوستان کی بہت سی برائیوں کو دور کرنے کے لئے مجھے بطور آلہ اس لئے چنا ہے کہ میں ملک کے سامنے عدم تشدد کا اصول پیش کروں۔ اب تک جو ترقی ہو چکی ہے۔ وہ عظیم ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

عدم تشدد ایک نہایت اعلیٰ درجے کی قوتِ عاملہ ہے۔ یہ روحانی طاقت یا ہمارے اندر کی خلائی طاقت ہے۔ نامکمل انسان اس جوہر کو کلی طور پر نہیں جان سکا۔ وہ اس کے پورے شعلے کو سہہ نہیں سکتا۔ مگر اس کا صغیر ترین جزو بھی ہمارے اندر عمل پذیر ہو کر عجیب و غریب کارنامے دکھلا سکتا ہے۔ آسمان میں چمکنے والا سورج ساری دنیا کو اپنی حیات بخش حرارت سے معمور کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کے نزدیک جا سکے۔ تو اُسے جلا کر راکھ کر دے گا۔ اسی طرح الوہیت کا حال ہے۔ ہم جس قدر عدم تشدد پر کاربند ہوتے ہیں۔ اسی قدر ہی خدا کی مانند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم کبھی پورے طور پر خدا نہیں ہو سکتے۔ عدم تشدد عمل پذیر ریڈیم کی مانند ہے۔ اس کا نہایت صغیر جزو مہلک پھوڑے میں مقیم ہو کر لگاتار چپکے چپکے کام کرتا ہوا بالآخر تمام بیمار ریشوں کو صحیح عضو میں بدل ڈالتا ہے۔ اسی طرح تھوڑا سا عدم تشدد بھی خاموش۔ لطیف اور غیر مرئی طریق پر کام کرتا ہوا ساری سوسائٹی میں سرایت کر جاتا ہے۔
میری رائے میں عدم تشدد کسی شکل یا صورت میں پُرسکون نہیں ہوتا۔ عدم تشدد جیسا کہ میں اسے سمجھتا ہوں۔ دنیا میں نہایت ہی کارگر طاقت ہے۔ عدم تشدد برترین قانون ہے۔ میرے آدھی صدی کے تجربے کے دوران میں مجھے اب تک کوئی ایسی

مثال نہیں ملی۔ جس میں خود کو بیکس کہہ سکتا تھا۔ یا عدم تشدد کے اندر کوئی تدبیر نہ دیکھ پاتا تھا۔

عدم تشدد کی ایک قطعی کسوٹی یہ ہے کہ غیر متشددانہ مقابلہ اپنے بعد کوئی خلش نہیں چھوڑتا۔ اور انجام کار دشمن بھی دوستوں میں بدل جاتے ہیں۔ افریقہ میں جنرل سمٹس کے تعلق میں مجھے یہی تجربہ حاصل ہوا تھا۔ وہ شروع شروع میں میرا سخت ترین دشمن اور نکتہ چین تھا۔ لیکن اب وہ میرا سرگرم دوست ہے۔

مَیں ایک نہ دبنے والا خوش امید انسان ہوں۔ میری خوش امیدی اپنی بنیاد اسی عقیدت میں رکھتی ہے کہ فرد عدم تشدد کی نشو و نما کے لئے بے پناہ امکانات رکھتا ہے تم اسے جس قدر اپنے وجود میں نشو و نما دیتے ہو۔ اسی قدر یہ متعدی ہوتا ہوا بالآخر تمہارے ماحول پر غالب آ جاتا ہے اور تھوڑے عرصہ کے اندر ہی ساری دنیا میں پھیل سکتا ہے۔

مَیں نے عدم تشدد کا سبق اپنی بیوی سے سیکھا ہے۔ جب میں نے اُسے اپنے ارادے کا مطیع بنانے کی کوشش کی۔ تب ایک پہلو پر میرے ارادے کے مقابلہ میں اس کی عازمانہ مزاحمت۔ دوسرے پہلو پر میری حماقت سے پیدا ہونے والے دُکھ کے آگے اس کی چپ چاپ تکالیف نے آخر کار مجھے اپنے کئے پر شرمسار کر کے میرے اپنے اس خیال کی حماقت سے شفایاب کر دیا کہ مَیں اس پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اور بالآخر وہ عدم تشدد میں میری معلمہ ہو گئی۔

جبکہ میں عالمگیر تشدد کے لئے جوج کرتا ہوں۔ میرا تجربہ ہندوستان پر محدود ہے۔ اگر یہ کامیاب ہو جائے۔ دُنیا اسے خود بخود ہی قبول کر لے گی۔ مگر اس میں ایک بڑی لیکن موجود ہے۔ مگر توقف مجھے پریشان نہیں کرتا۔ میرا عقیدہ ناقابل نفوذ تاریکی میں نہایت ہی تاباں صورت اختیار کر لیتا ہے۔

محبت ہی عدم تشدد کی بہترین صورت ہے

اہل سائنس کہتے ہیں کہ اگر ان ذرات میں جو ہماری زمین کو گھیرے ہوئے ہیں کشش اتصال موجود نہ ہوتی۔ تب زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ اور ہماری ہستی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ ٹھیک جس طرح اندھے مادہ میں قوتِ اتصال پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہی یہ لازمی طور پر تمام جاندار چیزوں میں بھی موجود ہے۔ اور زندہ موجودات کے درمیان اسی قوت اتصال کو ہی محبت کا نام دیا گیا ہے۔ ہم اسے باپ اور بیٹے۔ بھائی اور بہن۔ دوست اور دوست کے درمیان پاتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ بات سیکھنا ہے کہ کس طرح اس طاقت کو کل جانداروں کے تعلق میں برتا جائے۔ اور اس طاقت کے استعمال میں ہی ہم خدا کا علم حاصل کرتے ہیں۔ جہاں محبت نہیں ہے۔ وہاں کوئی زندگی نہیں ہے۔ نفرت تباہی اور موت کی طرف لے جاتی ہے۔

اگر عدم تشدد ہی ہماری ہستی کا قانون نہ ہو۔ تب وقتاً فوقتاً جنگ کی نموداری سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور ہر ایک لڑائی سابقہ لڑائی کو اپنی تندی میں ماند کرنے والی ہوگی۔

میں نے دیکھا ہے کہ زندگی تباہی کے درمیان بھی برقرار رہتی ہے۔ اور اسلئے ضروری ہے کہ تباہی سے برتر کوئی قانون موجود ہو۔ صرف اس قانون کے ماتحت ہی ایک اچھی طرح منظم سوسائیٹی قابل فہم اور زندگی جینے کے لائق ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ قانون زندگی ہے۔ تب ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس پر کاربند ہونا واجب ہے۔ جہاں کہیں تنازعات پائے جائیں۔ جہاں کہیں تمہارا دشمن کے ساتھ مقابلہ ہو۔ اُسے محبت کے ساتھ جیت لو۔ میں نے اس بھدے طریق سے اس قانون پر اپنی زندگی میں عملدرآمد کیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ میری تمام مشکلات حل ہو گئی ہیں۔ میں نے صرف اس قدر دیکھ پایا ہے۔ کہ جسطرح قانونِ محبت وقت پر کام کرتا ہے۔ اس طرح قانونِ اتلاف کبھی کارآمد نہیں ہوتا۔

تمام معلمین نے جو کبھی ہو گذرے ہیں۔ کم وبیش زور کے ساتھ اس قانون کی تبلیغ کی ہے۔ اگر محبت قانونِ حیات نہ ہوتی۔ تب زندگی موت کا لقمہ ہو چکی ہوتی۔ زندگی کیا ہے۔ موت کے اوپر دائمی نصرت ہے۔ اگر انسان اور حیوان کے درمیان کوئی بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ انسان اس قانونِ محبت کے ترقی پذیر علم کی قابلیت رکھتا ہوا اپنی شخصی زندگی میں اس پر کاربند ہو سکتا ہے۔ زمانہ قدیم و حال کے تمام سنت اپنی اپنی روشنی اور قابلیت کے مطابق ہماری ہستی کے اس بہترین قانون کی توضیح کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اکثر اوقات حیوان آسانی کے ساتھ غالب آجایا کرتا ہے مگر یہ بات قانون کی تردید نہیں کرتی۔ اس سے صرف عملی مشکل ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس قانون کے تعلق میں جو سچائی کی مانند بلندی رکھتا ہے۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

جب ساری دنیا میں اس قانون پر عملدرآمد ہو جائے گا۔ تب خدا اس زمین پر بھی اسی طرح حکمران ہوگا۔ جس طرح کہ وہ آسمان پر ہے۔ ہم زمین کو تو جانتے ہیں۔ مگر اپنے اندرونی آسمان سے بے خبر ہیں۔ اگر بعض میں اصولِ محبت کو ممکن العمل مانا جاتا ہے تب اور سبھی میں اس کے امکان سے منکر ہونا غرور کے سوا کچھ نہیں ہے......

میں رشتہ داروں اور اجنبیوں، دلیش باسیوں اور پردیسیوں، گورے اور رنگ والے، ہندو یا دوسرے غیر ہندو ہندوستانیوں، خواہ وہ مسلمان ہوں اور خواہ پارسی عیسائی یا یہودی ہوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ میرا دل اس قسم کے امتیازات کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اور میں اسے کوئی خاص خوبی خیال نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ بات میری فطرت میں داخل ہے۔ میری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے جب کہ عدم تشدد اور برہمچریہ اور دوسری بنیادی خوبیوں کے لئے مجھے لگاتار کوشش کرنی پڑتی ہے۔

میں جانتا ہوں۔ کہ اگر میں روحانی طاقت کو جو قوتِ محبت کا ہی دوسرا نام ہے مقبول عام بنا سکیں۔ تب میں تمہیں ایک ایسا ہندوستان دے سکوں گا۔ جو ساری دنیا کے بدترین سلوک کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو سکے گا۔ اسی لئے ہر گاہ و ناگاہ میں خود کو اس لئے منضبط کرنے میں لگا رہتا ہوں۔ کہ اپنی زندگی میں دکھ برداشت کرنے کے اس ابدی قانون کو ثابت کرتا ہوا ان لوگوں کی قبولیت کے لئے پیش کر سکوں جو اس امر کی پرواہ رکھتے ہیں۔ اور اگر میں کسی اور کام میں حصہ لیتا ہوں۔ تو میرا مقصد اسی قانون کی بے نظیر برتری کو ثابت کرنا ہی ہوتا ہے۔

میں پورے انکسار کے ساتھ معترف ہوں کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ کہ میں اپنے وجود کے ہر ایک ریشے میں محبت کی نمائندگی کے لئے کوشاں رہتا ہوں۔ خواہ میری یہ کوشش کتنی ہی ناقابل اطمینان کیوں نہ ہو۔ میں اپنے اس خالق کی حضوری کو محسوس کرنے کے لئے بے تاب ہوں۔ جو میری نظر میں عین سچائی ہے۔ اور میں نے اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں جان لیا تھا۔ کہ اگر میں سچائی کو پانا چاہوں۔ تب مجھے اپنی زندگی کے بدلے میں بھی قانونِ محبت پر عمل کرنا ہوگا۔ اور مجھے بچوں کی برکت عطا ہونے پر میں نے معلوم کیا کہ بچوں کے ذریعے ہی قانونِ محبت کو بہترین طور پر سمجھا اور سیکھا جا سکتا

ہے۔ اگر ہم جاہل والدین اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کرنے کے قابل ہوتے۔ ہمارے بچے بالکل ہی معصوم ہوتے۔ میں اس بات کو بلا دلیل و حجت مانتا ہوں کہ بچہ بُرے معنوں میں کبھی شریر پیدا نہیں ہوتا۔ اگر والدین بچوں کی بالیدگی کے زمانے میں اور ان کی پیدائش سے پہلے اور بعد اچھی طرح اپنا فرض ادا کریں۔ تب یہ مسلمہ سچائی ہے کہ بچہ جبلی طور پر ہی قانون صداقت اور قانونِ محبت کی پیروی کریگا۔ اور جب میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں اس سبق کو سیکھ لیا۔ تب زندگی میں بالتدریج مگر ایک خاص تبدیلی نمودار ہو گئی۔

تم میری حفاظت کے لئے کوشش مت کرو۔ بہترین ذات ہمیشہ ہی میری حفاظت کے لئے موجود ہے۔ تمہیں یقین رکھنا چاہیئے۔ کہ جب میرا وقت ہو چکیگا۔ کوئی شخص دُنیا کا بڑے سے بڑا انسان بھی خدا اور میرے درمیان حائل نہیں ہو سکیگا۔

دُنیا میں حیوانی طاقت ہزاروں سالوں سے حکمران ہوتی چلی آئی ہے اور نوع انسان اس کے کڑوے پھل چکھتی رہی ہے۔ جیسا کہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ مستقبل میں اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکلنے کی بہت کم امید ہے۔ اگر روشنی اندھیرے سے پیدا ہو سکتی ہو۔ تب نفرت سے بھی محبت کی پیدائش کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اگر تمہیں میری خدمت مطلوب ہے تو مجھے مت چھوڑ جاؤ۔ آؤ اور ہر بات مجھ سے سمجھ لو۔ تمہیں جان لینا چاہیئے۔ کہ ایک قاتل۔ چور اور ڈاکو گنہگار دنیا بھی میرے منشا کے خلاف ہے۔

نیک چلنی کے لئے محفوظ ترین قاعدہ یہ ہے۔ کہ ہم اس وقت قرابت کا دعوے کریں۔ جبکہ ہم خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ نہ کہ اس حالت میں اپنی رشتہ داری پر زور دیں۔ جبکہ ہم اپنا حق جتلانے ہوں۔ میں نے سچ مچ ہی ہندوستان میں مختلف صوبجات کے مابینی رشتوں میں چال چلن کے اس سنہری قانون کو برت کر دیکھا ہے۔

میں انسانی تعلقات میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں جانتا۔ اور سالہا سال کے تجربے نے اس نتیجے میں میرے یقین کو پختہ کر دیا ہے کہ جہاں کہیں اس سنہری قاعدے کو برتنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ وہیں لڑائی جھگڑے اور سر پھٹول دیکھنے میں آیا کرتے ہیں۔

تلوار کو ایک طرف پھینک دینے پر میں اپنے مخالفین کے سامنے پریم پیالہ بھینٹ کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رکھتا۔ اس پیالے کی پیشکش کے ذریعے ہی میں انہیں اپنی طرف کھینچنے کی توقع رکھ سکتا ہوں۔ میں انسان اور انسان کے درمیان پائیدار خصوصیت کا خیال ہی نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ میں دوبارہ جنم کے مسئلے کا قائل ہوں۔ میں اسی اُمید میں جیتا ہوں۔ کہ اگر اس زندگی میں نہیں۔ تو کسی اور زندگی میں میں ساری نوع انسان کو اپنے سینے سے لگا سکونگا۔

یقین کرو۔ میں سیکڑوں، بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربے سے جانتا ہوں۔ کہ تمہاری اور میری نسبت وہ لطیف تر احساس خودداری رکھتے ہیں۔ اگر ہم فروتنی اور انکسار سے بہرہ ور ہوں۔ تو زندگی کے بڑے سے بڑے اسباق بالغ اور تعلیم یافتہ لوگوں سے نہیں۔ بلکہ نام نہاد انجان بچوں سے سیکھے جا سکتے ہیں۔ مسیح نے کبھی اس سے بلند تر اور عظیم تر سچائی بیان نہیں کی۔ کہ ننھے بچوں کے منہ سے ہی حکمت کا ظہور ہوتا ہے۔ میں اسے مانتا ہوں۔ میں نے اپنے تجربے میں دیکھ لیا ہے۔ کہ اگر ہم ننھے بچوں کے ساتھ انکسار اور معصومیت کے ساتھ ملنے کے قابل ہوں۔ تب ہم ان سے حکمت و دانش سیکھ سکتے ہیں۔

میں نے یہ ایک سبق سیکھا ہے کہ جو بات انسان کے لئے ناممکن ہے۔ وہ ایشور کے لئے بچے کا کھیل ہے۔ اور اگر ہم اس الوہیت میں یقین رکھتے ہوں۔ جو ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کی قسمت پر بھی حکمران ہو رہی ہے۔ تب میں اس امر میں ذرا بھی

شک نہیں رکھ سکتا۔ کہ سب کچھ ممکن ہے۔ میں اس آخری امید کے سہارے جیتا اور سانس لیتا ہوا وقت گذارتا ہوں۔ اس کی مرضی کے تابع رہنے کے لئے کوشاں رہتا ہوں۔

میں اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔ کہ اہنسا۔ محبت کو اپنا راہنما اصول بنا لیا جائے۔ میں ذاتی طور پر امن پسند ہوں۔ میں تفرقات پیدا کرنا نہیں چاہتا اور میں اپنے مخالفوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ میں کوئی بھی ایسی بات نہ کروں گا۔ جو سچائی اور محبت کے خلاف ہو۔

میرے دل میں افراد انسانی اور نوع انسان کے لئے ذرا بداعتمادی نہیں ہے۔ وہ خدا کے روبرو جواب دہ ہوں گے۔ اس لئے مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر جہاں میرے مقصد زندگی کا تعلق ہے۔ وہاں میرا خیال خوب کام کرتا ہے اور میں شکوک اور بداعتمادی کے باوجود ہر شخص کا بھلا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے جان کنی کی حالت میں سے گذرنا پڑے۔ تو میں اسے تو برداشت کر لونگا۔ مگر جب تک کہ میں بدی کے خلاف جدوجہد کر سکتا ہوں۔ کبھی تساہل نہ کروں گا۔

میں اپنے مقصد زندگی میں یہ کامل عقیدہ رکھتا ہوں۔ کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ جیسا کہ میں کامیاب ہونگا۔ اور بالضرور کامیاب ہوں گا۔ تب تاریخ میرے مشن کو اس تحریک کے طور پر تحریر کرے گی۔ جو دنیا بھر کے لوگوں کو باہمی مخالفین کے طور پر نہیں۔ بلکہ ایک ہی کل کے اجزا کے طور پر باہم مربوط کرنے کیلئے ہے۔ میرا الشانہ ساری دنیا کے ساتھ رفاقت ہے اور میں بڑی سے بڑی محبت کو ناجائز امر کے خلاف بڑی سے بڑی مخالفت کے ساتھ یکجا کرنے کے قابل ہوں۔

جہاں محبت پائی جاتی ہے۔ وہیں خدا موجود ہوتا ہے۔

ہم ایسے زمانے میں سے گذر رہے ہیں۔ جہاں قدور (انسانی قیمتیں) بڑی تیزی سے بدلتی چلی جا رہی ہیں۔ ہم بالتدریج نتائج میں مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اور نہ ہی اہم

صرف ہم اپنے ہم ذات یا ہم ملک لوگوں کی بہبودی میں تسلی پا سکتے ہیں۔ ہم ساری نوع انسان کے لئے محسوس کرتے یا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں سچائی کی کھوج میں نوع انسان کے لئے عظیم کامیابی ظاہر کرتی ہیں۔

اگر ہم دُنیا میں حقیقی امن قائم کرنا چاہتے ہوں۔ اور اگر ہم لڑائی کے خلاف ایک حقیقی لڑائی جاری رکھنے کے خواہشمند ہوں۔ تب ہمیں اپنا کام بچوں سے شروع کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ اپنی فطری معصومیت میں نشوونما پا سکیں۔ تب ہمیں جدوجہد کرنے اور بے سود اور نکمی قرار دادوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ اس کے خلاف ہم محبت سے محبت اور امن سے امن کی طرف آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ اور انجام کار دُنیابھر کے تمام کونوں میں بھی وہ محبت اور امن پھیل جائیں گے۔ جن کے لئے دانستہ یا نادانستہ طور پر کل نوع انسان خواہش مند ہو رہی ہے۔

جہاں میں مدد نہیں کر سکتا۔ وہاں میں عزم بالجزم کے ساتھ روکاوٹ ڈالنے سے مُنکر رہونگا۔

محبت کبھی دعوے نہیں کرتی۔ یہ سدا دیتی ہے۔ محبّت سدا سہتی ہے۔ کبھی غصے میں نہیں آتی۔ کبھی بدلہ نہیں لیتی۔

میں انسانی فطرت میں شک کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ شریفانہ اور محبانہ عمل سے متاثر ہوتی ہے۔ اور متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔

اہنسا سے مراد صرف "نہ مارنا" ہی نہیں ہے۔ وہ شخص جو ایذا رساں جانداروں کو نہ مارنے پر ہی مطمئن ہو کر کل جانداروں کے لئے کوئی محبت نہیں رکھتا۔ آسمانی بادشاہت میں نہایت ادنٰے درجے کا متصور ہوگا۔ سچی محبت سمندر کی طرح غیر محدود ہوتی ہے اور اپنے اندر سے موج زن اور متلاطم ہوتی ہوئی باہر پھیلا کرتی ہے اور تمام سرحدوں سے پار ہوتی ہوئی ساری دُنیا کو گھیر لیتی ہے۔

لیکن اہنسا کے حامیوں کی مشکل یہی ہے۔ کہ انہوں نے اہنسا کو ایک اندھا عقیدہ بنا کر ہمارے درمیان اُس کی اشاعت کرنے کے راستے میں نہائیت بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اہنسا کے متعلق مروجہ (میری رائے میں غلط) تصور نے ہماری ضمیر کو بیہوش بنا کر ہمیں درشت الفاظی۔ کرخت رائے زنی۔ بددلی۔ غضب۔ نفرت۔ ظلم کے شوق کی مانند ہنسا کی کثیر التعداد عیارانہ صورتوں سے بے حس کر رکھا ہے۔ اس نے ہمیں یہ بات بھلا دی ہے کہ صرف رحمدلانہ طور پر مار دینے کی نسبت انسانوں اور حیوانوں کو آہستہ آہستہ عذاب دینا۔ اپنی خودغرضانہ ہوس کے بس میں انہیں بھوکا مارنا اور ان سے اپنے نفع کے لئے کام لینا۔ کمزوروں کی بلاوجہ تحقیر اور ان پر ظلم اور ان کی خودداری کو ملیامیٹ کرنا اپنے اندر بہت زیادہ ہنسا رکھتا ہے۔ اور ہم آجکل ان تمام باتوں کو اپنے چاروں طرف دیکھ پاتے ہیں۔

ساری دُنیا ہی ایک خدائی کُنبہ ہے

ہندو مذہب ہمیں سکھلاتا ہے کہ ہم ساری نوع انسان کو ایک ناقابل تقسیم اور غیر منقسم کنبہ جانتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک کو سب کی غلط کاریوں کیلئے ذمہ دار ٹھہرائیں۔

اور جو بات کنبوں اور فرقوں میں عائد ہوتی ہے۔ وہی قوموں پر صادق آتی ہے۔ اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ کنبہ کے لئے ایک قانون ہے اور قوموں کے لئے دوسرا قانون ہے۔

قومیں اس لئے متحد ہوتی ہیں کہ ان کے افراد کے درمیان باہمی لحاظ پایا جاتا ہے۔ ایک روز ہمیں اس قومی قانون کو ساری دُنیا میں اُسی طرح ہی وسعت پذیر کرنا ہوگا۔ جس طرح کہ کنبے کے قانون کو قوموں کی توضیح میں وسعت دی گئی ہے۔ خدا کا یہی فرمان ہے کہ ہندوستان ایک ایسی قوم ہو۔۔

محبت ہی نفرت کا علاج واحد ہے

نفرت کے اسباب ہر آنکھ کو نمایاں طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ قدیم رشیوں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ اس خرابی کا صرف یہی حل ہے کہ محبت سے نفرت کو باطل کر دیا جائے۔

نفرت سدا ہی مارا کرتی ہے۔ محبت کبھی نہیں مرتی۔ دونوں کے درمیان یہی عظیم فرق پایا جاتا ہے۔ محبت کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ سدا برقرار رہتا ہے۔ اور جو کچھ نفرت سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت ایک بوجھ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے نفرت بڑھتی ہے۔ انسان کا فرض نفرت کو گھٹانا اور محبت کو بڑھانا ہے۔

اتحاد عمل انسانی ہستی کا قانون ہے

ایک دوسرے کو مارنے والے مقابلے کی بجائے زندگی دینے والا اشتراک ہی انسانی ہستی کا قانون ہے۔ اس جذبے کو نظرانداز کرنے کے معنی اس امر سے انکار ہوں گے۔ کہ انسان احساسات رکھتا ہے۔ اگر ہم خدا کی صورت پر وضع کئے گئے ہیں۔ تب ہمیں صرف بعض کی بھلائی ہی نہیں اور بہتیروں کی بھلائی بھی نہیں۔ بلکہ کل کی بھلائی کے لئے جینا ہوگا۔

میرا مرکزی مقصد کل نوع انسان کے لئے مساوی سلوک ہے۔ اور اس مساوی سلوک سے مراد خدمت کی مساوات ہے۔

کیونکہ اگرچہ افراد انسانی یکساں طور پر عمر۔ قد۔ جلد اور عقل نہیں رکھتے۔ یہ اختلافات عارضی اور سطحی ہیں۔ وہ روح جو اس خاکی چھلکے کی تہ میں مخفی ہے کل ملکوں کے مردوں اور عورتوں میں وہی کی وہی ہے ....

اس سارے اختلاف میں جو ہم اپنے اردگرد دیکھ پاتے ہیں۔ ایک حقیقی اور

ذاتی وحدت پائی جاتی ہے۔ عدم مساوات کا لفظ بدبودار ہے۔ اور یہ مشرق اور مغرب میں غرور اور بے رحمیوں میں منتج ہوتا ہے۔ اور جو بات افراد انسانی پر صادق آتی ہے۔ وہی قوموں پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ وہ افراد کے مجموعوں کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ عدم مساوات کا جھوٹا اور بے لوچ عقیدہ ہی ایشیا اور افریقہ کی اقوام کی متکبرانہ لوٹ کھسوٹ کا باعث ہو رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مغرب میں مشرق کو اپنا شکار بنانے کی جو طاقت پائی جاتی ہے۔ وہ مغربی برتری اور مشرقی کمتری کی علامت ہے؟

مذہب کثیر التعداد ہیں۔ مگر انہیں زندگی دینے والی روح ایک ہے۔ اور جہاں اس ظاہری اختلاف کی تہ میں یہ ہمہ گیر بنیادی وحدت پائی جائے۔ وہاں اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیازات کے لئے گنجائش ہی کہاں ہے؟ کیونکہ یہ امر واقعہ ہے۔ جس کا روزانہ زندگی میں ہر قدم پر مشاہدہ کرتے ہیں۔ کل مذاہب کا آخری منشاء اسی ذاتی وحدت کو زندگی میں صورت پذیر کرنا ہے۔

فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ اتحاد

میں قدیم تہذیب کے مخفی خزانوں کی چھان بین میں مصروف ہوں۔ اور یہ ایک بے بہا نعمت میرے ہاتھ لگی ہے کہ قدیم ہندو تہذیب میں جو کچھ بھی پائیداری رکھتا ہے۔ وہ مسیح۔ بدھ۔ محمد۔ اور زردشت کی تعلیمات میں بھی موجود ہے۔

میں مسلمانوں کے ساتھ بھی ہندوؤں کی مانند پیار کرتا ہوں۔ میرا دل مسلمان اور ہندو دونوں کے لئے ہی یکساں طور پر محسوس کرتا ہے۔ اگر تم اسے چیر کر دیکھ سکتے تو جان لیتے۔ کہ اس کے اندر ایسے مختلف رخنے نہیں پائے جاتے۔ جن میں سے ایک تو مسلمانوں کے لئے ہو۔ اور دوسرا ہندوؤں کے لئے وعلیٰ ہذا القیاس۔

میں جانتا ہوں کہ اگر میرے عین حیات میں نہیں۔ تو میرے مرنے کے بعد ہندو

اور مسلمان دونوں ہی اس امر کے شاہد ہوں گے۔ کہ میں فرقہ وارانہ امن کے لئے سدا ہی تڑپتا تھا۔

ہندو مسلمان کے اتحاد کی لگن مجھے اوائل شباب سے ہے۔ میں بعض شریف ترین مسلمانوں کو اپنے دوست خیال کرتا ہوں۔ اسلام کی ایک پارسا دختر مجھے اپنی لڑکی سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ وہ اتحاد کے لئے جیتی ہے اور اس کی خاطر جان دینے کے لئے تیار ہے۔ بمبئی کی جامع مسجد کے سابق مؤذن کا لڑکا آشرم کا ایک کٹر مکین تھا۔

باہمی رواداری عملی رویے کا سنہری قانون باہمی رواداری ہے کیونکہ ہم کبھی یکساں طور پر سوچنے والے نہ ہونگے اور ہمیشہ سچائی کو جزوی طور پر اور مختلف زاویئے نگاہ سے دیکھا کریں گے۔ ضمیر بھی سب کے لئے ایک شئے نہیں ہے۔ جبکہ یہ انفرادی رویے کے لئے اچھا راہنما ہے۔ اپنے رویے کو سب پر نافذ کرنا ہر شخص کی ضمیر کی آزادی میں ایک ناقابل برداشت دخل اندازی ہوگا...... نہایت ضمیر پرست اور پارسا لوگوں کے درمیان بھی دیانتدارانہ اختلافات رائے موجود رہیں گے۔ اس لئے کسی بھی مہذب سوسائٹی کے لئے باہمی رواداری ہی عملی رویے کا اصول واحد ہونا چاہیئے۔

میں آپ سے یہی اپیل کرتا ہوں۔ کہ آپ اپنے دلوں کو صاف کریں اور فیاض بنیں۔ اپنے دلوں کو سمندر کی طرح فراخ بنا لو۔ دوسروں کے متعلق رائے زنی مت کرو۔ تاکہ تم پر بھی کوئی رائے زنی نہ کرے۔ وہ عادل مطلق موجود ہے جو اگر چاہے تو تمہاری جان لے سکتا ہے۔ مگر وہ تمہیں زندہ رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ تمہارے اندر اور باہر کثیر التعداد دشمن موجود ہیں۔ مگر وہ تمہاری حفاظت کرتا ہے جو تمہیں پُرشفقت نگاہ سے دیکھتا ہے۔

عفو ایک روحانی اور اس لئے ایک مثبت خوبی ہے۔ یہ منفی نہیں ہے بھگوان

بدھؔ بتلاتے ہیں۔ کہ "غصہ کو اکروہ دھ سے جیت لو۔" مگر اکرودھ کیا شے ہے؟ یہ ایک مثبت خوبی ہے۔ اس کے معنی فیاضی اور محبت ہیں۔ ضروری ہے کہ تم اس خوبی کی طرف بیدار رہو کر اسے ظاہر ہونے کا موقع دیتے ہوئے غضبناک ہونے والے شخص کے پاس جاکر اس کے غصے کا سبب دریافت کرو۔ اور اگر تمہیں کوئی شکایت ہے۔ تو اس کی تلافی کے لئے اس سے کہو اور اسے اس کی غلطی سے آگاہ کرتے ہوئے اسے یقین دلاؤ۔ کہ مشتعل ہو جانا غلطی کی بات ہے۔ روحانی صفت کا یہ شعور اور اس پر ارادی عمل در آمد نہ صرف انسان بلکہ اس کے ارد گرد کے کرۂ ہوائی کو بھی بلند کرتا ہے بلاشبہ وہی شخص اہمات پر عمل کرے گا۔ جس کے اندر محبت موجود ہے لگاتار کوشش کے ذریعے یقینی طور پر اس محبت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔

جو بات افراد پر صادق آتی ہے۔ وہی اقوام پر عائد ہوتی ہے۔ انسان کبھی حد سے زیادہ معاف نہیں کر سکتا (معافی کی کوئی حد نہیں ہونی چاہیئے) کمزور انسان کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ معاف کر دینا طاقتور لوگوں کی صفت ہے۔

بُزدلی اَور تشدّد

تشدّد بُزدلی سے بہتر ہے

میرا یقین ہے کہ جہاں ہمارے سامنے بزدلی اور تشدد کے درمیان چناؤ کا سوال آئے ۔میں تشدد کے چناؤ کا مشورہ دونگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جنگ بُوئر، نام نہاد زُلو بغاوت اور گذشتہ لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ نیز اسی لئے میں نے ان لوگوں کے لئے فوجی تربیت کی سفارش کرتا ہوں۔ جو طریق تشدد کے حامی ہیں۔ میں اس بات کو ترجیح دوں گا۔ کہ ہندوستان جنگ کے لئے آمادہ ہو کر اپنی عزت کی حفاظت کرے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ بزدلانہ طریق پر اپنی ذلت کو دیکھنے والا ایک بے کس غلام ہو جائے یا بنا رہے

(ینگ انڈیا۔ ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء)

میرا مسلکِ عدم تشدد ایک نہایت عالی طاقت ہے۔ اس میں بزدلی یا کمزوری کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایک تشدد کرنے والے انسان کے لئے تو کبھی غیر متشدد بننے کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر بزدل انسان کے لئے کوئی امید نہیں ہے۔ اس لئے میں

ان اوراق میں ایک سے زیادہ دفعہ کہہ چکا ہوں۔ کہ اگر ہم قوت برداشت یا عدم تشدد کے ذریعے اپنی عورتوں اور اپنے مندروں کی حفاظت کرنا نہیں جانتے۔ تب اگر ہم انسان ہیں۔ تو ہمیں کم از کم لڑائی کے ذریعہ ان سب کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

(ینگ انڈیا۔ ۱۶۔ جون ۱۹۲۷ء)

علم تشدد میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں باہمی راست بازی۔ انکسار۔ رواداری۔ اور محبانہ شفقت کو ترقی دیں۔ انگریزی میں کہاوت ہے کہ دیانت داری بہترین حکمت عملی ہے۔ مگر عدم تشدد کی اصلاحات میں یہ صرف حکمت عملی نہیں ہے۔ کیونکہ عملی حکمتیں بدل سکتی ہیں۔ اور بدلا کرتی ہیں۔ مگر عدم تشدد ایک ناقابل تغییر عقیدہ ہے۔ تمہیں اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے سخت تشدد کے درمیان بھی اس کی پیروی کرنی ہوگی۔ ایک غیر متشدد انسان کے ساتھ عدم تشدد کا برتاؤ کوئی خوبی نہیں رکھتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے تو عدم تشدد کہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر جب تشدد اور عدم تشدد کا باہمی مقابلہ ہوتا ہے۔ تب ہی انسان ان دونوں کے درمیان فرق کو محسوس کرتا ہے۔ مگر جب تک کہ ہم دائماً بیدار۔ خبردار اور کوشاں رہنے کے عادی نہ ہوں۔ اس اصول پر کاربند نہ ہو سکیں گے۔ اس لئے میں آپ سے اور خود سے دریافت کرونگا۔ آیا ہمارا عدم تشدد کمزوروں کا ہے۔ یا طاقتوروں کا جیسا کہ یہ ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ یہ ایک حد تک کمزوروں کے ہاتھوں میں بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ اور اس نے ہمارے درمیان اسی طور سے کام کیا ہے۔ مگر جب یہ کمزوری کا بہانہ بن جاتا ہے۔ تب یہ ہمیں نامرد بنا دیتا ہے۔ نامردی کی نسبت ان لوگوں کی بہادری بدرجہا بہتر ہے۔ جو جسمانی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ بزدلی کی نسبت لڑتے ہوئے اپنی موت کے ساتھ بغل گیر ہونا ہی بہتر ہوگا۔ غالباً ہم شروع شروع میں سبھی جوشیلے تھے۔ اور میں یہ یقین کرنے کے لئے مستعد ہوں کہ ہم تدریجی ارتقا کے ذریعے

حیوان سے انسان ہو گئے ہیں۔ اس طرح پر ہم حیوانی طاقت لیکر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ہم نے انسانی صورت اس لئے اختیار کی ہے کہ ہم خدا کو پہچان لیں۔ جو ہمارے اور بسا ہے۔ در اصل یہی بات ہی تو انسان کا خاص استحقاق ہے۔ اور اسی کے ذریعے ہی وہ دیگر حیوانات سے تمیز کیا جاتا ہے۔ مگر معرفت ایزدی کے معنی ہیں کل جانداروں میں دیکھنا۔ دوسرے الفاظ میں کل مخلوقات کے ساتھ اپنی وحدت محسوس کرنا ہے۔ اور یہ بات اس وقت تک ناممکن رہیگی۔ جب تک کہ ہم ارادتاً جسمانی طاقت کو خیرباد کہتے ہوئے اس باشعور عدم تشدد کو نشو و نما نہ دیں۔ جو ہم میں سے ہر ایک کے اندر مخفی طور پر موجود ہے۔ اور یہ بات قوت سے ہی نمودار ہو سکتی ہے۔ کیا ہم طاقتوروں کا عدم تشدد رکھتے ہیں؟ ہمارا اختیار ہے کہ ہم اسے ناممکن قرار دے کر ترک کر دیں۔ اور اس کی بجائے طریق تشدد اختیار کر لیں مگر ہمیں ان دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہی پڑیگا۔

اگر تشدد کا طریقہ وافر تربیت چاہتا ہے۔ تو عدم تشدد کا طریقہ اس سے کہیں زیادہ تربیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس کے لئے تربیت تشدد کرنے والے کی تربیت کی بہ نسبت بہت زیادہ مشکل ہے۔ اس تربیت کا پہلا قدم خدا میں زندہ (اٹل) (وشواس) ہے۔ جو شخص خدا کی ہستی میں زندہ اعتقاد رکھتا ہے۔ وہ منہ سے خدا کا نام لیتا ہوا کبھی برے اعمال کا مرتکب نہ ہوگا۔ وہ تلوار کی بجائے خدا پر بھروسہ رکھیگا۔ بزدلی خدا میں ایمان ظاہر نہیں کرتی۔ سچا مرد خدا تلوار استعمال کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر وہ یہ جانتا ہے کہ ہر ایک انسان خدا کی شبیہ ہے۔ اس کا استعمال نہیں کرتا

میں ساری قوم کو نامرد بنانے کی نسبت عدم تشدد کے خطرے میں ہزاروں دفعہ پڑنے کے لئے تیار ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکوؤں یا چنڈوں یا ہندوستان پر حملہ آور قوم کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت تشدد کو بالکل ہی منفی کر دو۔ مگر اس کام کو بہتر طریق سے بنانے کے لئے

ضروری ہوگا۔ کہ ہم خود منضبط ہوں۔ ذرا سی بات پر پستول اٹھا لینا طاقت کی بجائے کمزوری کی علامت ہے۔ باہمی مکا بازی تشدد کی بجائے نامردی سکھلاتی ہے۔ میرا طریق عدم تشدد کبھی کمزوری کی طرف نہیں لے جاتا۔ بلکہ صرف یہی طریقہ اگر قوم چاہے تو اسے خطرے کے وقت اسے منضبط اور متفقہ طور پر تشدد کے قابل بنا سکیگا۔

میرا عدم تشدد خطرے سے بھاگنا اور اپنے اقربا کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑ جانا نہیں سکھلاتا۔ تشدد اور بزدلانہ نقل کے درمیان میں صرف تشدد کو ہی بزدلی پر ترجیح دے سکتا ہوں۔ میں ایک بزدل شخص کو اسی طرح ہی عدم تشدد کی تلقین نہیں کر سکتا جسطرح کہ ایک اندھے انسان کو صحت بخش مناظر سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ عدم تشدد بہادری کی چوٹی ہے۔ اور میں نے اپنے تجربے میں ان لوگوں کے روبرو جنہوں نے تشدد کے مدرسے میں تربیت پائی ہے۔ عدم تشدد کی برتری دکھلانے میں کبھی کوئی مشکل محسوس نہیں کی۔ میں کئی سالوں تک جبکہ میں بزدل تھا۔ تشدد کے خیالات سوچتا رہا۔ اور میں صرف اس وقت سے ہی عدم تشدد کا قدردان ہونے لگا۔ جبکہ میں نے بزدلی کو خیرباد کہنا شروع کیا۔

میں اپنے شخصی عقیدے کو دوسروں پر ٹھوپ نہیں سکتا۔ اور نہ ہی کبھی قومی نظام پر ایسا کر سکتا ہوں۔ البتہ میں قوم کو اس کی خوبی اور فائدے کے متعلق یقین دلانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ یہ ایک بڑی مصیبت کی بات ہوگی۔ کہ اگر ملک دیگر ذرائع سے ترقی کر رہا ہو۔ تو میں اپنے ہٹیلے پن سے اس کی راہ میں حائل ہو رہا ہوں۔ بشرطیکہ وہ طریقے مثبت طور پر شرارت آمیز اور مضر نہ ہوں۔ مثال کے طور پر میں واقعی تشدد کے مقابلے میں اکیلا ہی کھڑا ہو جاؤنگا۔ مگر میں نے جان لیا ہے کہ اگر قوم چاہے تو وہ عدم تشدد کے ذریعے اپنا حق آزادی حاصل کرنے کا استحقاق رکھتی ہے۔ ہاں اس حالت میں ہندوستان میری جنم بھومی ہونے کے باوجود اسی طرح ہی میری پریم بھومی نہ رہے گی۔

جس طرح کہ میں اپنی ماں کے گمراہ ہو جانے پہ اس پر کوئی فخر نہیں کر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اندر دوسروں کو مارے بغیر خود مر جانے کی پُر ضبط دلیری پیدا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ دلیری نہ رکھتا ہو۔ تب میری یہی خواہش ہو گی۔ کہ خطرے سے بھاگ جانے کی بجائے وہ خود کو مرنے مارنے کے فن میں تربیت دے کیونکہ خطرے سے بھاگنے والا شخص اپنی دوڑ کے باوجود ذہنی ہنسا (تشدد) کا مرتکب ہوا کرتا ہے۔ وہ اس لئے بھاگا کرتا ہے۔ کہ وہ مارنے کے عمل میں خود مر جانے کی جرأت نہیں رکھتا۔

دُنیا بالکل منطق کے تابع ہی نہیں ہے۔ خود زندگی میں کسی نہ کسی قسم کا تشدد ملا جاتا ہے۔ ہمیں کم از کم مزاحمت کا راستہ چُننا ہو گا۔

اس شخص کو جو مرنے سے ڈرتا ہے اور مزاحمت کی ذرا طاقت نہیں رکھتا۔ عدم تشدد نہیں سکھلایا جا سکتا۔ ایک بے کس چوہا صرف اس وجہ سے غیر متشدد نہیں۔ کہلا سکتا۔ کہ اسے بلی کھا جاتی ہے۔ اگر اس میں طاقت ہوتی۔ تو وہ بلی کو خوشی خوشی کھا جاتا مگر وہ سدا اس سے خائف ہو کر دوڑ جاتا ہے۔ ہم اسے بزدل نہیں کہتے کیونکہ اسے فطرت نے ہی ایسا بنایا ہے۔ کہ وہ اس سے بہتر رویہ اختیار کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔ لیکن اگر کوئی انسان خطرے کی حالت میں چوہے کی مانند رویہ اختیار کرے تو اسے جائز طور پر بزدل کہا جاتا ہے۔ اس کے دل میں تشدد اور منافرت کے خیالات ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ خود کو ایذا پہنچائے بغیر دشمن کو مار سکتا تو وہ اس کے لئے تیار ہوتا۔ وہ عدم تشدد کو جانتا ہی نہیں۔ اس کے متعلق سارا وعظ ہی اس کے لئے بالکل بے سود ہو گا۔ بہادری اس کی فطرت سے تعلق نہیں رکھتی۔ پیشتر اس کے کہ وہ عدم تشدد کا سبق سمجھ سکے۔ اس حملہ آور کے مقابلے میں جو اسے مغلوب کرنا چاہتا ہے۔ اپنی کوشش میں قائم برجا رہ کر موت کی قبولیت کا سبق سیکھنا ہو گا۔ اس کے خلاف عمل اس کی

بزدلی کی توثیق کرتا ہوا اسے عدم تشدد سے اور بھی پرے لے جانے کا اثر رکھیگا جبکہ میں کسی شخص کو بدلہ لینے میں واقعی طور پر مدد نہیں دے سکتا۔ میں ایک بزدل انسان کو بھی نام نہاد عدم تشدد کی پناہ لینے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ عدم تشدد کی اصل حقیقت کو نہ جانتے ہوئے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہر بار خطرے سے بھاگ جانا مزاحمت کرنے کی نسبت ایک خوبی ہے۔ خاصکر جبکہ اس مزاحمت میں اپنی زندگی ہی خطرے میں ہو۔ عدم تشدد کا معلم ہونے کی حیثیت سے مجھ سے جہاں تک بن پڑیگا۔ میں اس نامردانہ عقیدے کی مخالفت کروں گا۔

خود حفاظتی کیلئے مارنے کی طاقت ضروری نہیں ہے۔ انسان کے پاس مرنے کی طاقت ہونی چاہیئے۔ جب انسان پورے طور پر مرنے کے لئے تیار ہوگا۔ تب وہ مزاحمت کرنے کی خواہش ہی نہ رکھیگا۔ درحقیقت میں اس بات کو بطور خود روشن قضیہ کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔ کہ مارنے کی خواہش مرنے کی خواہش کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے اور تاریخ ایسے افراد انسانی کی مثالوں سے پر ہے۔ کہ جنہوں نے دلیری کے ساتھ مرتے وقت اپنے لبوں سے ترحم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے متشدد مخالفین کے دلوں کو بھی پگھلا ڈالا تھا۔

جہاں ہم خود ایثاری کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ وہاں حفظ نفس ہی واحد باعزت طریق عمل ہو سکتا ہے۔

عدم تشدد وہ بڑی سے بڑی طاقت ہے جسے نسل انسان استعمال کر سکتی ہے۔ یہ تباہی کے اس بڑے سے بڑے ہتھیار سے بھی بڑھ کر طاقتور ہے۔ جو آج تک انسانی عقل ایجاد کر سکی ہے۔ انسان صرف اس حالت میں ہی آزادانہ طور پر جی سکتا ہے۔ جبکہ وہ بالضرورت اپنے بھائی کے ہاتھ سے مرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اسے مارکردہ کبھی آزادانہ طور پر نہیں جی سکتا۔ ہر ایک قتل جو دوسرے کا کیا جائے۔ اور

ہر ایک ایذا جو دوسرے کو پہنچائی جائے۔ خواہ ان کی وجہ کچھ ہی ہو۔ نوع انسان کے خلاف جرم ہے۔

میرے عدم تشدد کے مدرسے میں اس شخص کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے جو اسلحہ کو رکھتا ہوا اور ان کے موثر طریق پر استعمال کے قابل ہو کر بھی غیر متشدد نہیں ہو سکتا یا نہیں رہنا چاہتا۔ میں ہزارھویں بار پھر کہوں گا۔ کہ عدم تشدد طاقتوروں کی چیز ہے مگر بزدلوں کی نہیں۔

اس امر کا کچھ مضائقہ نہیں۔ کہ کوئی کسی دوسرے شخص سے جسمانی لحاظ سے کمزور ہو۔ اگر بھاگ جانا اس کے لئے شرم کی بات ہے۔ تو وہ اپنی جگہ پر مقیم رہ کر وہیں اپنی جان دیدے گا۔ یہی عدم تشدد اور بہادری ہے۔ وہ شخص بھی بہادر ہے جو جسمانی طور پر کتنا ہی کمزور ہونے پر بھی اپنے دشمن کو ایذا پہنچانے میں اپنی طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ اسے غیر متشدد نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر وہ اس وقت بھاگ جاتا ہے۔ جبکہ خطرے کا مقابلہ کرنا اس کا فرض ہے۔ تو وہ بزدل ہے۔ پہلی مثال میں انسان اپنے اندر محبت اور فیاضی رکھیگا۔ دوسری اور تیسری مثالوں میں ناپسندیدگی بدگمانی اور خوف پائے جائیں گے۔

دُنیا کے بہترین اذہان نے عدم تشدد کی روح کو جذب نہیں کیا۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کا مقابلہ پرانے طریق سے ہی کریں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ابھی تک جنگل کے قانون سے بہت آگے نہیں بڑھ سکے۔ اور ہم نے اس ورثہ کی قدر شناسی نہیں سیکھی۔ جو ہمیں خدا سے ملا ہے۔ اور عیسائیت جو انیس سو برس پرانی ہے۔ اور اس سے بھی قدیم تر بدھ مذہب اور ہندو مذہب بلکہ اسلام کی تعلیمات کے باوجود ہم افراد انسانی کی حیثیت سے بہت ترقی نہیں کر سکے۔ لیکن جب کہ میں ان لوگوں کی طرف سے طاقت کے استعمال کو سمجھتا ہوں۔ جو عدم تشدد کی روح سے

بے بہرہ نہیں ہیں۔ میں ان لوگوں سے جو اس روح سے بہرہ ور ہیں۔ تقاضا کرونگا۔ کہ وہ اپنے سلسلۂ اثر کو اس امر کے ثابت کرنے میں لگا دیں کہ عدم تشدد کے ذریعے ڈاکوؤں کا مقابلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

آج کل یہ کہنا ایک فیشن ہو چلا ہے کہ سوسائٹی کو غیر متشددانہ طریقوں سے چلایا یا منظم نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس امر متنازعہ فیہ کی تنقیح کرتا ہوں۔ ایک کنبے کے اندر جب باپ اپنے شریر لڑکے کے منہ پہ تھپڑ لگاتا ہے۔ تب لڑکا اس کا بدلہ نہیں لیا کرتا۔ مگر وہ تھپڑ کے شرارت سے باز رکھنے والے اثر کی وجہ سے باپ کی اطاعت نہیں کرتا۔ بلکہ باپ کی اس آزردہ محبت کے باعث جسے وہ اس تھپڑ کے پیچھے محسوس کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہی بات اس طریق کار کا نچوڑ ہے۔ جس کے مطابق سوسائٹی منظم ہے۔ یا ہونی چاہیئے۔ اور جو بات کنبے پر صادق آتی ہے۔ لازمی طور پر نوع انسان پر بھی عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ نوع انسان ہمارے وسیع تر کنبے کے سوا اور ہے ہی کیا؟ ﷺ

ستیاگرہ

ستیاگرہ ایک ایسی تلوار ہے۔ جو ہر طرف چل سکتی ہے۔ یہ اسے بھی برکت دیتی ہے جو اسے چلاتا ہے اور اس شخص کو بھی جس کے خلاف یہ چلائی جاتی ہے۔ خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر یہ دور دراز کے نتائج پیدا کرتی ہے۔ اسے نہ کبھی زنگ لگتا ہے اور نہ یہ کبھی چرائی جا سکتی ہے۔

سچائی کے ساتھ اہنسا کو لئے ہوئے تم ساری زمین کو اپنے قدموں پر لا سکتے ہو۔ ستیاگرہ اپنی اصلیت میں سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کہ سیاسی یعنی قومی زندگی میں سچائی اور شرافت کو داخل کیا جائے۔

نافرمانبرداری کے مہذب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مخلصانہ۔ محترمانہ، منضبط۔ غیر سرکشانہ اور کسی اچھی طرح سمجھے ہوئے اصول پر مبنی ہو اور اس میں بے اصولانہ من کی موج اور سب سے بڑھ کر اس کی تہ میں بدخواہی یا نفرت نہ پائی جائے۔

ایک ستیاگرہی خوف کو ہمیشہ کے لئے ترک کردیتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے دشمن پر بھی بھروسہ کرنے سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ اگر دشمن اسے بیس بار دھوکہ دے۔ تو بھی ستیاگرہی اکیسویں بار اس پر اعتماد کرنے کے لئے تیار رہے گا۔ کیونکہ انسانی فطرت میں اعتماد کامل اس کے عقیدہ کا اصلی جوہر ہے۔

سچ مچ ایک ہی ستیاگرہی ناجائز کے مقابلے میں جائز کی لڑائی میں جیت جانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

ستیاگرہ کی اس وقت تک قطعی طور پر جیت نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ بزدلی موجود ہے۔ مگر وہ لوگ جو خود کو کمزور یقین کرتے ہیں۔ محبت کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اس لئے ہر صبح ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے۔ کہ عہد کریں۔ کہ "میں روئے زمین پر کسی سے نہیں ڈروں گا۔ میں صرف خدا سے خائف رہونگا میں کسی کا بدخواہ نہ ہونگا۔ میں کسی شخص کی طرف سے بے انصافی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرونگا۔ میں جھوٹ کو سچائی کے ذریعے فتح کروں گا۔ اور جھوٹ کا مقابلہ کرتے ہوئے کل دکھ اور مصیبت برداشت کرونگا"۔

ستیاگرہی کبھی بھی نہیں ہے۔ جو جبلی طور پر قانون کا پابند نہیں ہے۔ یہ اس کی پابندِ قانونِ فطرت ہی ہے۔ جو اسے برترین قانون کی بے چون و چرا اطاعت کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ یہی ضمیر کی آواز ہے۔ جو دیگر تمام قوانین کو ہیچ قرار دیا کرتی ہے۔

ستیاگرہ کی یہی خوبی ہے کہ یہ خود بخود ہمارے پاس آجاتا ہے۔ اس کی تلاش میں کہیں باہر نہیں جانا پڑتا۔ اس اصول کی یہی ذاتی اور اندرونی صفت ہے۔ وہ دھرم یدھ جس میں کوئی راز محفوظ نہیں رکھا جاتا۔ اور جس میں مکاری اور جھوٹ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ خود بخود ہمارے حصے میں آجاتا ہے۔

اور ایک دھارمک شخص اس دھرم یدھ کے لئے سدا تیار رہتا ہے۔ وہ جدوجہد جس کے لئے پہلے سے ہی تجاویز سوچنی پڑتی ہیں راست بازانہ جدوجہد نہیں ہوتی راست بازانہ جدوجہد میں خدا خود ہی لڑائی کے نقشے تیار کر کے اس لڑائی کی رہنمائی کرتا ہے۔ دھرم یدھ کو صرف ایشور کے نام پر ہی لڑا جا سکتا ہے۔ اور ٹھیک اس لمحہ میں جب کہ ستیا گرہی خود کو بالکل ہی بیکسی کی حالت میں پاتا ہو آخری دموں پر ہوتا ہے اور اپنے چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ دیکھ نہیں پاتا۔ خدا اس کے بچانے کے لئے آن موجود ہوتا ہے۔

میری پختہ رائے ہے کہ ستیا گرہ آئینی تحریک کا پاکیزہ ترین طریقہ ہے۔ البتہ یہی طریقہ مخرب اخلاق اور قابل تحقیر بھی ہو جاتا ہے۔ جب کہ اس کی مہذبانہ یا غیر متشددانہ صفت محض دکھلاوا ہی ہو۔ اگر عدم تشدد کی دیانت داری ایک امر مسلم ہو تب شدید ترین نافرمانبرداری کو بھی صرف اس وجہ سے قابل مذمت قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کے تشدد میں منتج ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ کسی بھی عظیم یا سریع الرفتار تحریک کو دلیرانہ طور پر خطروں میں بڑھے بغیر چلایا نہیں جا سکتا اور وہ زندگی جس میں عظیم خطرے غیر موجود ہوں۔ جینے کے لائق ہی نہیں ہے کیا تاریخ عالم اس امر کی شاہد نہیں ہے کہ اگر خطرات موجود نہ ہوتے۔ تب زندگی میں رومانیت کا نام نشان تک نہ پایا جاتا۔ ستیا گرہ کیا ہے؟

قطعی خود فراموشی۔ بڑی سے بڑی انکساری۔ بڑے سے بڑا صبر اور نہایت تابدار عقیدت ہے۔ یہ اپنا صلہ آپ ہی ہے۔

ستیا گرہی نہ تو کوئی زمانی حد رکھتا ہے اور نہ ہی اس کی قوت برداشت کسی طور سے محدود ہوتی ہے۔ اس لئے ستیا گرہ میں شکست کی مانند کوئی شئے نہیں پائی جاتی۔

ستیاگرہ ہر ایک شہری کا ذاتی حق ہے۔ وہ انسانیت کو ترک کئے بغیر اس حق کو چھوڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ستیاگرہ کبھی ابتری اور بدنظمی میں منتج نہیں ہوتا۔ مجرمانہ نافرمانی ابتری کی موجب ہو سکتی ہے۔ ہر ایک حکومت مجرمانہ نافرمانبرداری کو زور سے دبایا کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ خود ہی مٹ جاتی ہے۔ مگر سول نافرمانی کو دبانے کے معنی ضمیر کو قید کرنا ہیں۔

ہم نہیں چاہتے کہ انسانی وجود میں سے اس کے بہترین عنصر کو خارج کر دیا جائے۔ مگر اسی وجہ سے ہم اسے نامرد بھی نہیں بنانا چاہتے۔ اور جب انسان اپنے اصلی مرتبے کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کا اندرونی حیوان لازمی طور پر گاہ بگاہ اپنا مکروہ چہرہ دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں کسی طرح کجروی کو پسند نہیں کرتا۔ میری نظر میں ستیاگرہ کا قانون محبت کا قانون ہے یک ابدی قانون ہے۔ میں تمام نیک امور میں تعاون کرتا ہوں۔ اور میں جو کچھ بھی برا ہے۔ اس کے ساتھ عدم تعاون کرنا چاہتا ہوں۔

ستیاگرہ ایک طاقت ہے۔ جو خاموشی کے ساتھ ظاہراً آہستہ آہستہ کام کرتی ہے در حقیقت دنیا میں اور کوئی ایسی طاقت موجود نہیں۔ جو اس طرح براہ راست اور تیز رفتاری کے ساتھ کام کرتی ہو۔

میں ستیاگرہ میں ہزاروں لوگوں کو ارادی طور پر اپنی جانیں کھو دینے کی اجازت اس وجہ سے نہیں دیتا۔ کہ میں زندگی کو کم قدر خیال کرتا ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ میں جانتا ہوں۔ کہ انجام کار اس میں زندگی کم از کم ضائع ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ ان لوگوں کو شرف دیتا ہے۔ جو اپنی جانیں گنوا دیتے ہیں۔ اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے دنیا کو اخلاقی طور پر مالا مال بنا تا ہے۔

دکھ برداشت کرنا اپنی مشخص حدود رکھتا ہے۔ دکھ سہنا عاقلانہ بھی ہو

سکتا ہے۔ اور احمقانہ بھی۔ اور جب دُکھ اپنی حد پر پہنچ جاتا ہے۔ اسے طوالت دینا نہ صرف غیر عاقلانہ فعل ہوگا۔ بلکہ ایسا کرنا حماقت کی انتہا ہوگا۔

جب ستیاگرہی سدا ایذا سہنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ وہ مساوی طور پر امن کا بھی مشتاق ہوتا ہے۔ وہ امن و صلح کے ہر ایک باعزت موقعہ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

ستیاگرہ ایک طاقت ہے۔ جسے فردِ واحد اور جماعات استعمال کر سکتی ہیں۔ اور اسے سیاسی امور میں بھی اسی طرح ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کہ خانگی امور میں۔ اس کا عالمگیر طور پر قابل استعمال ہونا اس کے غیر فانی اور ناقابل تسخیر ہونے کا ثبوت ہے۔ اسے مرد، عورت، بچے سبھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ وہ طاقت ہے جسے کمزور لوگ اس وقت تک استعمال کیا کرتے ہیں۔ جب تک کہ وہ تشدد کے جواب میں تشدد کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اس طاقت کو تشدد اور اس لئے کل ظلم اور بے انصافی کے ساتھ وہی نسبت ہے۔ جو روشنی تاریکی کے ساتھ رکھتی ہے۔ سیاسیات میں اس کا استعمال اس عملی اُصول پر مبنی ہوتا ہے کہ لوگوں پر اس وقت تک ہی حکومت کرنا ممکن ہے۔ جب تک کہ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر محکوم رہنے کے لئے خود رضامند ہوتے ہیں۔

چونکہ ستیاگرہ عملی احتجاج کا سب سے بڑھ کر زبردست طریق ہے۔ ستیاگرہی ستیاگرہ شروع کرنے سے پہلے اور تمام دیگر وسائل استعمال کر چکتا ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اور لگاتار منظم حکومت کے پاس پہنچتا اور رائے عامہ سے اپیل کرتا ہے۔ رائے عامہ کو تیار کرتا ہے۔ اور جو بھی سننا چاہے۔ اس کے روبرو اپنے معاملے کو بڑی شانتی اور خنک مزاجی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اور جب وہ ان تمام وسائل کو پوری طرح استعمال کر چکتا ہے۔ تب ہی وہ ستیاگرہ کے طریق پر چلنا شروع کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے اندر سے ہی اندرونی آواز کا محرک بلاواسطہ ستیاگرہ کو شروع کر دیتا ہے۔ تب

نہ تو اس کے واپس لوٹنے کی کوئی صورت رہ جاتی ہے اور نہ وہ کبھی پیچھے کی طرف ہٹتا ہے اور جب ایک بار یہ طاقت حرکت پذیر ہو چکی ہو۔ اور اس کا عمل کافی شدت رکھتا ہو تب یہ ساری دنیا پر غالب آسکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے بڑی سے بڑی طاقت ہے کیونکہ یہ روح کا برترین اظہار ہے۔

ستیا گرہی کے ضابطے میں حیوانی طاقت کے روبرو اطاعت پذیر ہونے کا ذکر ہی نہیں پایا جاتا۔ یا اس کی اطاعت دکھ سہنے کی اطاعت ہوتی ہے۔ سنگین کو استعمال کرنے والے کے آگے کبھی نہیں۔

میرا یہ یقین بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کہ وہ اشیاء جو لوگوں کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ صرف عقل سے حاصل ہونے کی بجائے قوت برداشت کے ذریعہ خریدی جا سکتی ہیں۔ دکھ برداشت کرنا انسانی دنیا کا قانون ہے۔ جبکہ لڑائی جنگل کا قانون ہے۔ لیکن دشمن کے دل کو بدلنے اور اس کے کانوں کو جو بصورت دیگر بالکل بند ہوتے ہیں۔ عقلی آواز کی طرف کھولنے کی غرض سے برداشت کا طریق جنگل کے قانون کی بہ نسبت بے انداز زیادہ موثر ہے۔

ایک ستیہ آگرہی شیطان کے پروں پر بہشت کی طرف اڑنا بھی پسند نہ کریگا۔ میں ستیہ آگرہی کے طور پر اپنے متعدیوں کے ہمیشہ اور بار بار پرکھے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ اگر کوئی غلطی معلوم ہو جائے۔ تو اس کی تلافی کرنے کے لئے تیار رہتا ہوں۔

ستیا گرہ شریفانہ رویہ رکھتا ہوا کسی کو زخمی نہیں کرتا۔ ضروری ہے کہ یہ غصے اور بد دلی کا نتیجہ نہ ہو۔ یہ کبھی مضطرب بیقرار و بے صبر اور پرشور نہیں ہوتا۔ یہ جبر کی عین ضد ہے۔ تشدد کے مکمل بدل کے طور پر اس کی تشکیل ہوئی ہے۔

لازمی طور پر ایک ستیا گرہی سچائی اور اہنسا کو اپنا مسلک جانتا ہوا اس انسانی فطرت کی ذاتی نیکی میں یقین رکھتا ہے جسے وہ اپنے دکھ کی راہ سے ظہور پذیر

سچائی اور محبت سے جگانے اور اُبھارنے کی توقع رکھتا ہے۔

ستیاگرہ میں مکر اور جھوٹ اور کسی قسم کی ناراستی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے آجکل مکر اور جھوٹ کا دُنیا میں دَور دورہ ہے۔ مَیں ایسی حالت میں دیکھتا ہوا صرف تماشا نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں آج چُپ چاپ اور بے حرکت ہو کر بیٹھ رہوں۔ تب خدا اس خزانے کو جو اس نے اس آتش زدگی کے درمیان جو ساری دُنیا کو گھیرے ہوئے ہے مجھے دیا ہے۔ استعمال نہ کرنے کے لئے مجھے سرزنش کرے گا۔

ستیاگرہی انسان باعزت شرائط پر مصالحت کرنے کے موقع کو نہ کبھی کھوتا ہے اور نہ کھو سکتا ہے۔ جب کہ یہ بات ہمیشہ مسلّم سمجھی جاتی ہے کہ ناکامیابی کی صورت میں وہ سدا یُدھ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسے تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے منصوبے سدا ہی سب کے سامنے کھلے ہوتے ہیں۔

ستیاگرہ شروع کرنے سے پہلے ایک شرط جس کا پہلے پورا ہونا لازمی ہے۔ یہ ہے کہ ستیاگرہ کے حامیوں اور عام لوگوں کی طرف سے تشدد نہ کرنے کی ضمانت حاصل ہو۔ تشدد شروع ہونے پر یہ کوئی جواب نہ ہوگا۔ کہ حکومت یا ستیاگرہ کے خلاف دوسرے لوگوں کا اشتعال تشدد کے لئے ذمہ دار ہے۔ یہ بات سب پر روشن ہونی چاہیئے کہ ستیاگرہ تشدد کے کرۂ ہوائی میں کبھی فروغ پذیر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ ستیاگرہی کے تمام ذرائع ختم ہو چکے ہیں۔ اُسے ستیاگرہ کے سوا دیگر ذرائع معلوم کرنے چاہئیں۔

اس بات کو اکثر اوقات فراموش کر دیا جاتا ہے۔ کہ ستیاگرہی کبھی یہ نیت نہیں رکھتا کہ وہ غلط کار کو متحیر اور پریشان کرے۔ اس کی اپیل اس کے خوف کی بجائے سدا اس کے دل سے ہُوا کرتی ہے اور ہونی لازمی ہے۔ ستیاگرہ کا مقصد غلط کار کو مجبور کرنے کی بجائے اس کا دل بدلنا ہوتا ہے سوائے اپنے تمام اعمال میں تصنعات سے محترز رہنا چاہیئے۔

وہ سدا قدرتی طور پر اندھے عقیدہ سے کام کرتا ہے۔

مسیح ، ڈینی ایل اور سقراط ستیاگرہ یا روحانی طاقت کی پاکیزہ ترین مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ سارے معلمین اپنی روح کے مقابلے میں اپنے اجسام کو ہیچ خیال کرتے تھے۔ زمانہ حال میں ٹالسٹائی اس مسئلے کا بہترین اور نہایت شاندار شارح ہوا ہے اس نے اس مسئلہ کی صرف تشریح ہی نہیں کی۔ بلکہ اس کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔

یوروپ میں اس تعلیم کی ترویج سے بہت پہلے ہندوستان میں اسے سمجھا اور عام طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ اس امر کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کہ روحانی طاقت جسمانی طاقت پر بے انداز برتری رکھتی ہے۔ اگر لوگ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے روحانی طاقت کا استعمال کرنے لگ جائیں۔ تب بہت سے موجودہ دکھ دور ہو جائیں۔

میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ستیاگرہ کا طریقہ نہایت ہی پاکیزہ اور محفوظ طریقہ ہے۔ کیونکہ اگر مقصد صحیح اور سچا نہ ہو۔ تو صرف ستیاگرہ کرنے والوں کو ہی تکلیف ہوتی ہے۔

بہرحال اس میں طاقت کا استعمال کبھی دوسروں کو دکھ نہیں دیتا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ایذا رسان ہونے کی بجائے حق کے خلاف استعمال کی جاتی ہے یہ صرف استعمال کرنیوالوں کو دکھ دایک ثابت ہوتی ہے یہ نیکی کی مانند اپنا صلہ آپ ہی ہے۔ اس قسم کی طاقت کے استعمال میں ناکامیابی کوئی معنی اور وجود ہی نہیں رکھ سکتی۔

میں نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا۔ کہ میں ہی سب سے پہلا ستیاگرہی ہوں۔ میں اگر دعوے کرتا ہوں تو صرف اس بات کا کہ میں نے اس اصول کو عالمگیر پیمانے پر استعمال کیا ہے اور ابھی اس بات کا دیکھنا اور ثابت کرنا باقی ہے کہ اس تعلیم کو تمام ملکوں اور زمانوں میں ہزارہا لوگ جذب کر سکتے ہیں +

عدم تشدد بہترین شے ہے

لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ عدم تشدد تشدد سے لے اندازہ فوقیت رکھتا ہے اور عفو سزا دینے کی بہ نسبت زیادہ مردانہ عمل ہے۔ معاف کر دینا سپاہی کی زینت کا موجب ہوتا ہے مگر سزا نہ دینا اسی حالت میں معافی کہلا سکتا ہے۔ جبکہ سزا دینے کی طاقت موجود ہو۔ ایک بیکس شخص کی طرف سے معافی کا دیا جانا کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔ وہ چوہیا جو بلی کو اپنے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ بھلا کیا معافی دے سکتی ہے؟

میں بد اخلاقیوں کے خلاف ایک ذہنی اور اس لئے اخلاقی مخالفت کی تجاویز سوچا کرتا ہوں۔ میں ظالم کی تلوار کی دھار کو ایک تیز تر دھار والی تلوار کے ذریعے کند کرنے کی بجائے بلکہ اس کی اس توقع کو ہی خاک میں ملا دیتا ہوں۔ کہ میں اس کا جسمانی طور پر مقابلہ کرونگا۔ اس کی بجائے میں جو روحانی مزاحمت پیش کرونگا۔ وہ اس کی گرفت میں نہ آسکے گی۔ میں اسے ابتداء میں حیران اور بالآخر

اعتراف کے لئے مجبور کرونگا - اور وہ اعتراف اس کی تذلیل کا موجب ہونے کی بجائے اس کا مرتبہ بھی بلند کرنے والا ہوگا۔

اس لئے مجھے متکبر نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر میں دلائل پیش کئے بغیر عدم تشدد کی کامیابی کے مفہومات اور شرائط کو بیان کروں۔ وہ حسب ذیل ہیں :-

۱- عدم تشدد انسانی نسل کا قانون ہے - اور حیوانی طاقت کی بہ نسبت بے اندازہ درجے زیادہ عظمت اور برتری رکھتا ہے۔

۲- انجام کار یہ ان لوگوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوتا - جو محبت کے خدا میں کوئی یقین نہیں رکھتے۔

۳- عدم تشدد اپنی خودداری اور عزت کی حس کو پورے طور پر محفوظ رکھتا ہے - لیکن یہ اراضی یا جائیداد منقولہ کی ہمیشہ حفاظت نہیں کر سکتا - اگرچہ ان کی حفاظت کے لئے بھی یہ مسلح انسانوں کی بہ نسبت مضبوط تر پشت و پناہ ثابت ہوتا ہے عدم تشدد نفس الامر میں ناجائز طریق سے حاصل کئے ہوئے منافع اور بد اخلاق اعمال کی حفاظت میں امداد نہیں کرتا۔

۴- جو افراد یا قوم عدم تشدد پر کاربند ہونا چاہتے ہوں۔ انہیں اپنی عزت کے سوا ہر شے (قوموں کو اپنا آخری فرد) قربان کرنے کے لئے آمادہ رہنا ہوگا۔ اسلئے عدم تشدد دوسرے لوگوں کے ممالک پر قبضہ یا ممالک حالی کی شہنشاہیت کے ساتھ جو صاف طور پر اپنی حفاظت کے لئے طاقت پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ کوئی مناسبت نہیں رکھ سکتا۔

۵- عدم تشدد وہ طاقت ہے جسے بچے - نوجوان - عورتیں اور بالغ لوگ سبھی استعمال کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ محبت کے خدا میں عقیدت اور اس لئے کل نوع انسان کے لئے مساوی محبت رکھتے ہوں۔ جب عدم تشدد کو اصول زندگی کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ تو ضروری ہے کہ یہ خاص خاص صورتوں میں استعمال کئے جانے کی بجائے سارے وجود میں سرائیت پذیر ہو جائے۔

۶- یہ فرض کرنا ایک نہائیت گہری غلطی ہے کہ جب کہ یہ قانون افراد کیلئے تو بہت اچھا ہے۔ مگر نوع انسان کے عوام الناس کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔

عدم تشدد کی تبلیغ نہیں کی جا سکتی۔ اس پر کاربند ہوگا بیرونی نشانات کے ذریعے لوگوں کو تشدد کا عادی بنایا جا سکتا ہے۔ تم پہلے تختوں پر۔ پھر چاندماریوں پر اور پھر حیوانوں پر گولیاں چلایا کرتے ہو۔ اس کے بعد ہی تمہیں مارنے کے عمل کی سند دی جاتی ہے غیر متشدد انسان کوئی بیرونی نشانات نہیں رکھتا۔ اور اس لئے نہ صرف اس کی تقریر بلکہ اس کا عمل بھی غیر موثر معلوم ہوا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ایسے میٹھے الفاظ استعمال کروں جنہیں میں عملی صورت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اور اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے لئے حقیقی محبت رکھتا ہوا اپنے بیرونی رویہ سے تمہیں نفرت انگیز دکھائی دوں۔ تب بیرونی طور پر دونوں حالتوں میں میرا عمل وہی کا وہی ہونے پر بھی مختلف اثر رکھتا ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات ہمارے عمل کا اثر اس حالت میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ جب کہ یہ ظاہراً معلوم نہ ہوتا ہو۔ چنانچہ وہ غیر شعوری اثر جو تم مجھ پر ڈال رہے ہو۔ شاید مجھے اس کا کبھی علم نہ ہو۔ اس پر بھی یہ نامعلوم اثر کی نسبت بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ تشدد میں کچھ بھی غیر مرئی نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف عدم تشدد کا تین چوتھائی جو وہ غیر مرئی ہی ہے۔ اس کا اثر اس کے غیر محسوس ہونیکے ساتھ نسبت معکوس رکھتا ہے۔ عدم تشدد جب عمل پذیر ہو کر غیر معمولی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔ تب یہ کرامات ہو جاتا ہے۔ اس طرح پہلے پہل تو عوام الناس کے ذہن پر نامعلوم طور پر اثر ہوتا ہے۔ پھر معلوم طور پر اور جب ذہن شعوری طور پر متاثر ہو جاتا ہے۔ تب قابل مشاہدہ نتیجہ حاصل ہوتی ہے۔ میں نے اپنے تجربے میں دیکھا ہے کہ جب لوگ کمزور ہوتے ہوئے معلوم ہونے تھے۔ میرے اندر شکست کا کوئی احساس نہ تھا۔

میرا عدم تعاون

میرے عدم تعاون کے پس پشت میرے دل میں نہایت شدید خواہش موجود رہتی ہے کہ ذرا سا بہانہ ملنے پر بھی اپنے بدترین مخالفین کے ساتھ تعاون کروں۔ میرے ایسے شخص کی نظر میں جو ایک نامکمل انسان ہونے کے باعث سدا خدائی رحمت کا محتاج ہے کوئی شخص بھی ناقابل نجات نہیں ہے۔

طویل تجیانہ اور عبادت گذارانہ انضباط کی بدولت میں چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے کسی شخص سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک بڑا دعویٰ ہے۔ مگر میں اسے انکسار کے ساتھ کرتا ہوں۔ لیکن جہاں کہیں بدی موجود ہو۔ اس سے نفرت کر سکتا ہوں اور کرتا ہوں۔

عدم تعاون کیا ہے۔ بدی میں نادانستہ طور پر اور بالواسطہ حصہ لینے کے خلاف احتجاج ہے۔ بدی کے ساتھ عدم تعاون اسی طرح ہی ہمارا فرض ہے جس طرح کہ نیکی کے ساتھ تعاون۔

میں جبلی طور پر تعاون کرنے والا ہوں۔ میں اسی لئے عدم تعاون کیا کرتا ہوں۔ کہ لگاؤ کمینہ پن اور جھوٹ سے پاک ہو جائے۔ کیونکہ میری رائے میں ایسا ناپاک تعاون تعاون کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے۔

میں کسی بھی چیز کے خلاف بے وفائی کے خیالات دل میں نہیں رکھتا۔ مگر میں ہر ایک جھوٹ بے انصافی اور بدی کے خلاف ہوں..... میں کسی ادارے کے ساتھ اس وقت تک وفادار رہتا ہوں۔ جب تک کہ وہ میری اپنی اور میری قوم کی نشوونما میں معاون ہوتا ہے۔ جونہی مجھے یہ علم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ادارہ میری نشوونما میں معاون ہونے کی بجائے اس میں مانع ہوتا ہے۔ تب میں اس سے باغی ہونا اپنا فرض مقدس تصور کرتا ہوں۔

میرا عدم تعاون نفرت کی بجائے محبت میں اپنی جڑ رکھتا ہے۔ میرا مذہب مجھے کسی شخص سے کبھی نفرت کرنے سے قطعاً روکتا ہے۔ میں نے اس سیدھے سادے مگر عظیم الشان سبق کو بارہ برس کی عمر میں ایک درسی کتاب سے سیکھا تھا۔ اور میرا عقیدہ نہ صرف اب تک برقرار چلا آتا ہے۔ بلکہ دن بدن ترقی پذیر ہے۔ میرے دل میں اس نے ایک شعلہ زن جذبے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

میرا عدم تعاون میرے عقیدے کا ایک جزو ہونے کے باوجود تعاون کا پیش خیمہ ہے۔ میں طریقوں اور نظامات کے ساتھ عدم تعاون کیا کرتا ہوں۔ لوگوں کے ساتھ کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ ڈائر کے خلاف بھی میں بدخواہی کا خیال دل میں نہ لا سکوں۔ کیونکہ میں بدخواہی کو انسانی شان کے شایاں ہی نہیں جانتا۔

مذہب اور سیاسیات

میں مذہب کو اپنی زندگی کی نہایت گہری جڑوں سے جدا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے سیدھی سادی دلیل یہ ہے کہ میری سیاسیات فاسد اور کھوٹی سیاسیات نہیں ہیں۔ انہیں عدم تشدد اور سچائی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

میں اس وقت تک مذہبی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ میں خود کو ساری نوع انسان کے ساتھ ایک نہ سمجھوں۔ اور سیاسیات میں حصہ لئے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسانی اعمال کا حلقہ ایک ناقابل تقسیم کل ہے۔ تم مجلسی۔ اقتصادی۔ سیاسی اور خالص طور پر مذہبی کام کو مصنوعی طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں انسانی عمل سے الگ کوئی مذہب نہیں دیکھ پاتا۔ یہ تمام دیگر اعمال کے لئے وہ بنیاد مہیا کرتا ہے۔ جو مذہب کے بغیر غیر موجود ہوتی اور زندگی ایک بے معنی شور و غل کے سوا کچھ وقعت نہ رکھ سکتی۔

میں مذہب کے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے سیاسی احباب مجھ سے اس وجہ سے مایوسی ظاہر کرتے ہیں کہ میری سیاسیات کی بنیاد بھی مذہب میں ہے۔ اور وہ باتی پر

ہیں۔ میری سیاسیات اور میرے تمام دیگر اعمال میرے مذہب کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ میں تو اس سے بھی آگے بڑھکر یہ کہونگا۔ کہ ایک مذہبی انسان کے ہر عمل کی جڑ مذہب میں ہونی چاہیئے کیونکہ دہرم کے معنی ایشور کیساتھ وابستہ ہونا ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خدا تمہارے ہر ایک سانس پر حکمران ہو۔

پرنچ مذہب کو ہمارے تمام اعمال میں ساری ہونا چاہیئے۔ یہاں مذہب سے مراد فرقہ وارانہ مذہب نہیں ہے۔ اس سے مراد کائنات کی اخلاقی حکومت میں عقیدت ہیں۔ دہرم کو اس کے غیر مرئی ہونیکی وجہ سے غیر حقیقی نہیں کہہ سکتے۔ یہ دہرم ہندو مذہب اسلام۔ عیسائیت وغیرہ کی حدود سے برتر ہے۔ مگر ان مذاہب کو منسوخ کرنیکی بجائے انہیں ہم آہنگ اور حقیقی بناتا ہے۔

میرے لئے تو مذہب کے بغیر سیاسیات محض گندگی ہے۔ جس سے سدا دور رہنا چاہیئے۔ سیاسیات اقوام سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جو بات قوموں کی بھلائی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسے انسان سے متعلق ہونی چاہیئے جو مذہبی میلان رکھتا ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا اور سچائی کا طالب ہو۔ میرے لئے خدا اور سچائی مبادلہ پذیر الفاظ ہیں اور اگر کوئی شخص مجھے یہ کہے کہ خدا جھوٹ اور تعذیب کا خدا ہے۔ تب میں اس کی پرستش سے ہی منکر ہو جاؤنگا۔ اس لئے سیاسیات میں بھی ہمیں خدائی بادشاہت قائم کرنی ہوگی۔

میں سیاسیات کو دیگر قومی مساعی سے مختلف نوعیت کی چیز نہیں سمجھتا۔ سیاسیات کے لغوی معنی علم شہریت ہیں۔ نیز یہ شستہ اطوار کے ساتھ بھی رشتہ رکھتی ہے۔ چونکہ اب شہریت کی حدود اس قدر وسیع ہو گئی ہیں۔ کہ وہ اپنے اندر سب اغلبیوں کو بھی جگہ دیتی ہیں۔ علم سیاسیات میں مجلسی۔ اخلاقی۔ اقتصادی اور سیاسی وغیرہ تمام پہلوؤں میں تمام نوع انسان کی ترقی کا حصول شامل ہے۔ یہاں پر لفظ "سیاسی" کو مروجہ اور تنگ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

آزادی

یہ میرا پختہ یقین ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی آزادی نہیں کھو سکتا۔ جب تک کہ اس کے اپنے اندر کمزوری موجود نہ ہو۔

آہستہ آہستہ حصول آزادی کا لفظ بے معنی ہے۔ آزادی پیدائش کی مانند ہے جب تک ہم پوری آزادی حاصل نہ کریں۔ تب تک ہم غلام ہی رہتے ہیں۔ ہر ایک قسم کی پیدائش ایک لمحے میں وقوع پذیر ہوا کرتی ہے۔

اگر ہم آزاد مرد اور عورت کے طور پر نہیں جی سکتے۔ ہمیں مرنے کے لئے رضا مند رہنا چاہیئے۔

انسان کو اپنی آزادی کیلئے اپنا ہی شکر گذار ہونا چاہیئے۔ وہ جس دم ہی آزادی کے لئے ٹھان لیتا ہے۔ اسی دم ہی آزاد ہو جاتا ہے۔

نہایت جابرانہ حکومت بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ جب تک محکوم لوگ اس کے لئے رضامند نہ ہوں۔ اس رضامندی کو جابر حکمران لوگ اکثر اوقات جبر سے حاصل کیا۔

کرتے ہیں۔ جونہی رعایا جابرانہ حکومت کا ذد چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔

خوددار انسان کے لئے سونے کی بیڑیاں لوہے کی بیڑیوں سے کمتر ناگوار اور عذاب دہ نہیں ہوتیں۔ اور یہ عذاب دھات کی بجائے بیڑیوں میں پایا جاتا ہے۔

جس طرح ہر ایک ملک کھانے۔ پینے اور سانس لینے کی قابلیت رکھتا ہے اسی طرح ہر ایک قوم اپنے معاملات کے انصرام کے قابل ہوتی ہے۔ خواہ وہ کیسے ہی خراب طریق سے کرے۔

کوئی ظلم بھی آج تک اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جب تک کہ وہ مظلوم کو اپنے ساتھ نہ لے۔ اگرچہ اکثر اوقات اسے جبراً اپنے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ مزاحمت کے نتائج سے خوف زدہ ہو کر ظالم کے ارادے کی اطاعت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی لئے تخویف پسندی ظالم کے تجارتی سرمایہ کا ایک جزو بن گئی ہے۔ مگر ہم تاریخ میں ایسی مثالیں دیکھ پاتے ہیں۔ جہاں تخویف پسندی ظالم کے حکم کو مظلوم پر نافذ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

جمہوریت کا صحیح تصوّر

جمہوریت کے متعلق میرا تصور جمہوریت کے اس تصور کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا جس میں جسمانی طاقت کے ذریعے لوگوں کو اطاعت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

عوام کو پھسلانے کی مانند کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عام لوگ کوئی ذہن اور پہلے سے سوچ بچار نہیں رکھتے۔ وہ دیوانہ وار جوش سے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اور جلدی پچھتانے لگ جاتے ہیں۔ میں جمہوریت کی روح کو نشوونما دینے کے لئے ہی عدم تعاون کا استعمال کر رہا ہوں۔

جمہوریت کا اصلی جوہر یہ ہے۔ کہ ہر ایک شخص ہی ان مقاصد کا نمائندہ ہے جن سے قوم بنا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خاص خاص مفاد کی اخاص نمائندگی کو خارج نہیں کرتی۔ اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیئے۔ مگر یہ نمائندگی اس کا نصب العین ہونے کی بجائے اس کے نقص کی علامت ہے۔

جب لوگ سیاسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں تب لوگوں کی آزادی میں خلل کا کمترین امکان رہ جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ قوم جو حکومت کی دخل اندازی کے بغیر اپنے امور کو شائستہ اور موثر طریق سے سرانجام دیتی ہے سچے معنوں میں جمہوری قوم ہے۔ جہاں یہ شرط موجود نہ ہو۔ وہاں جمہوریت برائے نام ہوتی ہے۔

جمہوریت اس بات سے کوئی تخالف نہیں رکھتی کہ چند اشخاص ان لوگوں کی روح، امید اور تمناؤں کی نمائیندگی کرتے ہوں جن کی نمائیندگی کا وہ دعوے کرتے ہیں میری رائے میں جبری وسائل سے جمہوریت کا ارتقا نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت کی روح باہر سے تھوپی نہیں سکتے۔ یہ اندر سے ہی نمودار ہوا کرتی ہے۔

عوام یا حکومت کی طرف سے تخویف پسندی کے درمیان جمہوریت کا قیام ممکن نہیں ہے۔ بعض پہلوؤں میں تو عوام کی تخویف پسندی حکومت کی تخویف پسندی سے بھی بڑھ کر جمہوریت کی نشو ونما میں مانع ہوتی ہے۔ کیونکہ موخرالذکر جمہوریت کی روح کو جگاتی ہے۔ جب کہ مسبوق الذکر اس روح کو مار دینے کا اثر رکھتی ہے ضروری ہے کہ ہم ان عوام کو تربیت دیں۔ جو سنہری دل رکھتے ہوئے ملک کے لئے محسوس کرتے ہیں۔ اور جو تعلیم اور راہنمائی کے خواستگار ہیں۔ اگر صرف چند مہیہ اور مخلص کارکن افراد موجود ہوں۔ تو ساری قوم ہی منظم ہو مہیمانہ طور پر کام کر سکتی ہے۔ اور انبوہ گردی آئین جمہوریت ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔

جمہوریت اور تشدد ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو حکومتیں آج کل برائے نام جمہوری ہیں۔ اگر وہ سچے معنوں میں جمہوری ہونا چاہتی ہوں۔ تب انہیں دلیرانہ طور پر غیر متشدد ہونا ہوگا۔ یہ کہنا سراسر بے حرمتی ہے کہ صرف افراد ہی عدم تشدد پر کاربند ہو سکتے ہیں۔ اور اقوام جو افراد کی مجموعہ ہو سکتی ہیں۔ اسے عمل میں نہیں لا سکتیں۔

میں جمہوریت پسند ہونے کا مدعی ہوں۔ بشرطیکہ نوع انسان کے مفلس ترین طبقے کے ساتھ عینیت اور ان سے بہتر طریق پہ نہ جینے کی زبردست تمنا اور اس تمنا کے مطابق اس لیول پہ پہنچنے کے لئے حتی الامکان شعوری کوشش کسی شخص کو جمہوریت پسند کہلانے کا مستحق بناتے ہوں۔

سچا جمہوریت پسند وہ ہے۔ جو بالکل غیر متشددانہ وسائل سے اپنی آزادی اور اس لئے اپنے ملک کی اور بالآخر کل نوع انسان کی حفاظت کے لئے تیار رہے۔

قانون اکثریت

ضمیر کے معاملے میں قانون اکثریت کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

قانون اکثریت بہت محدود استعمال رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ فرد کو تفصیلی امور میں اکثریت کے روبرو جھک جانا چاہیئے۔ لیکن اکثریت کے روبرو جوابدہ ہونا ایک طرح کی غلامی ہے۔ خواہ اس کے فیصلے کچھ ہوں۔ جمہوریت اس حکومت کا نام نہیں جس میں لوگ بھیڑوں کی مانند ہانکے جاتے ہوں۔ جمہوریت میں فرد کے لئے رائے اور عمل کی آزادی کی حد کسی کے ساتھ نگہبانی کی جاتی ہے۔ اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ اقلیت کو اکثریت سے بالکل ہی مختلف طریق پر عمل کرنے کا پورا حق حاصل ہے

ہمیں فرمان کے مسئلہ کو مضحکہ خیز حدود تک دھکیل کر اکثریتوں کی قراردادوں کا بھی غلام نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے معنی تو حیوانی طاقت کی تند صورت میں دوبارہ ترویج ہونگے۔ اگر اقلیتوں کے حقوق قابل لحاظ ہیں تب اکثریت کیلئے لازمی ہے کہ وہ انکی رائے اور عمل کا احترام کرے ...... یہ دیکھتے رہنا اکثریت کا فرض ہوگا۔ کہ اقلیتوں کی بات اچھی طرح سے سنی جائے۔ اور بصورت دیگر انہیں اپنی بے حرمتی کا ذرا اندیشہ نہ رہے۔ سوراج اس حالت میں محض بے معنی ہوگا۔ جبکہ افراد اکثریت کے آگے اپنی قوت فیصلہ کو خیرباد کہنے کیلئے بے بس ہوں۔

سوراجیہ کے معنی

سوراج ایک متبرک اور ویدک لفظ ہے۔ اس سے مراد خود اختیاری اور خود ضبطی ہے۔ نہ کہ کل ضبط سے آزادی جسے اکثر اوقات خود مختاری کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

سوراج سے میری مراد ہندوستان کی وہ حکومت ہے۔ جو لوگوں کی اس رضامندی سے ہو۔ جو مرد یا عورت، ملک میں پیدا شدہ یا باہر سے آکر آباد ہوئے۔ ان بالغوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد سے حاصل کیجائے۔ جنہوں نے دستی محنت سے ملک کی خدمت کرنے کے علاوہ اپنا نام ووٹر کے طور پر درج کرانے کی تکلیف گوارا کی ہو۔

سوراج چند آدمیوں کے حکمران ہونے کی بجائے سب لوگوں کے اس قابل ہو جانے سے حاصل ہوگا۔ کہ وہ حکومت کے ناجائز استعمال کا مقابلہ کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں سوراج عوام کو ایسی تعلیم دینے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ جو انہیں حکومت کو ضبط اور قابو میں رکھنے کی اپنی ذاتی قابلیت کی طرف بیدار کر دے۔

میں یہ کہنے کی دلیری رکھتا ہوں کہ سوراج خدا بھی عطا نہیں کر سکتا۔ ہمیں اسے خود ہی

حاصل کرنا ہوگا۔ سوراج اپنی فطرت میں ہی کسی ... کے دینے کی چیز نہیں ہے۔

ہم بعض اوقات سن پاتے ہیں کہ اگر ہم ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے بڑا کوئی وہم نہیں ہو سکتا۔ کسی قوم نے آج تک اس طرح آزادی حاصل نہیں کی۔ موسم بہار کی شان ہر ایک درخت میں منعکس ہوا کرتی ہے۔ اور ساری زمین نوجوانی کی تازگی سے معمور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب سوراج کی روح درحقیقت سوسائٹی میں سرایت کر جاتی ہے۔ تب ایک اجنبی شخص بھی ہمارے درمیان آکر زندگی کے ہر ایک شعبے کو طاقت سے بھرپور پاتا ہوا دیکھے گا۔ کہ خادمانِ قوم اپنی اپنی قابلیت کے مطابق رفاہِ عام کے مختلف کاموں میں مشغول ہو رہے ہیں ؛

میرے خیال میں سوراج میں صرف یہی تربیت درکار ہے۔ کہ ہم ساری دنیا کے مقابلے میں اپنی حفاظت کریں اور اپنی قدرتی زندگی کو کامل آزادی کے ساتھ گذارنے کے قابل ہوں اگرچہ یہ پُر از نقائص ہی ہو۔ نیک اور اچھی حکومت سوراج کا بدل نہیں ہو سکتی۔

سوراج کبھی ایک قوم سے دوسری قوم کو بطور عطیہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ خزانہ ہے۔ جو قوم کے بہترین خون کے ذریعہ ہی خریدا جا سکتا ہے۔ جب ہم اسے مہنگے بھاؤ خریدیں گے۔ تب یہ ہمارے لئے عطیہ نہ رہے گا..... سوراج لگاتار محنت اور بے انداز دُکھ کا پھل ہوگا۔

سوراج کیا ہے؟ موت کے ڈر کو چھوڑ دینا۔ وہ قوم جو موت کے ڈر سے متاثر ہو سکتی ہے۔ وہ سوراج حاصل نہیں کر سکتی۔ اور اگر کسی طرح سے حاصل بھی کرے۔ تو اُسے برقرار نہیں رکھ سکتی۔

میرا سوراج یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی روح برقرار رہے۔ میں کئی نئی چیزیں لکھنا چاہتا ہوں، مگر وہ لازمی طور پر ہندوستانی سلیٹ پر ہی لکھی جائیں گی۔ میں مغرب سے

صرف اُس وقت خوشی کے ساتھ اُدھار لینے کے لئے تیار رہوں گا۔ جب کہ میں معقول سود کے ساتھ اس اُدھار چکانے کے قابل ہونگا۔

خود اختیاری سے مراد حکومت کی کنٹرول سے آزاد ہونے کی لگاتار کوشش ہے خواہ وہ حکومت خارجی ہو یا قومی۔

میرا سوراج دوسروں کے قتل کا ثمر ہونے کی بجائے لگاتار خود ایثاری کا امدادی عمل ہوگا۔ میرا سوراج حقوق کا خونریز غصب ہونے کی بجائے فرض کی اچھی طرح اور سچے طور پر ادائیگی کے خوبصورت اور قدرتی پھل کے طور پر طاقت کا حصول ہوگا۔ یہ ہیرو کے نمونے کا نہیں۔ بلکہ ہتھنیہ کی قسم کا جوش پیدا کریگا۔ یہ عام طور پر اُس وقت حاصل ہُوا کرتا ہے۔ جب کہ افق تاریک ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے حصول سے پہلے نوجوان مردوں اور عورتوں کی وہ جماعت کھڑی ہوگی۔ جو کام ہی اور صرف قوم کی خاطر پیدا جوش محسوس کرنے والی ہوگی۔

میرا خیال ہے کہ ایک خود ایثار اور ثابت قدم منظم جماعت کے بغیر عوام کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اور عوام کی ترقی کے بغیر سوراج کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سوراج کی طرف ترقی ان کارکنوں کی تعداد کے عین مطابق ہوگی۔ جو غریبوں کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے۔

میرے یا ہمارے سوراج کے منصوبے میں نسلی یا مذہبی امتیازات کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ اور نہ ہی یہ تعلیم یافتہ یا ذی ثروت لوگوں کا اجارہ ہوگا۔ سوراج سب کے لئے ہوگا۔ یہ نہ صرف اہل علم وزر کو اپنے اندر جگہ دے گا۔ بلکہ خاص طور پر اپنے اندر لُولے لنگڑے۔ اندھے اور فاقہ زدہ محنت کش لوگوں کو شامل کرنے والا ہوگا۔

اگر ہم سوراج کو سچائی اور عدم تشدد کی راہ سے حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ تب نیچے سے اوپر تک لگاتار تعمیر کے لئے تعمیری کوشش ہی طریق واحد ہے

یہ بات اس امر کو جائز قرار دیتی ہے کہ موجودہ نظام کو اُلٹ پلٹ کرنے کی غرض سے اس اُمید کے ساتھ جان بوجھ کر ایک لانظمی حکومت پیدا کی جائے کہ وہ اپنے اندر سے ایک ایسا حاکم مطلق پیدا کرے گی۔ جو لوہے کے ڈنڈے سے حکومت کرتا ہُوا بدنظمی میں سے خوش نظمی پیدا کر دے گا۔

میرے رام راج کے معنے ہندو راج نہیں ہیں۔ رام راج سے میرا مطلب خدائی سلطنت یا ایزدی بادشاہت سے ہے۔ میرے لئے رام اور رحیم ایک ہی معبود کے نام ہیں۔ میں سچائی اور پارسائی کے خدا کے سوا اور کسی خدا کا قایل نہیں ہوں۔ میرے تخیل کا رام خواہ اس زمین پر کبھی رہا ہو۔ اور خواہ نہ رہا ہو۔ رام راج کا قدیم معیار بلاشبہ اس سچی جمہوریت کا معیار ہے۔ جس میں ایک ادنےٰ سے ادنےٰ فرد بھی کسی طویل اور گراں قیمت دستور العمل کے بغیر جلدی کے ساتھ انصاف پانے کا یقین رکھ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ شاعر نے رام راج میں کتے کے لئے بھی انصاف حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ہندوستانی سوراج کے معنی اکثریت رکھنے والی جماعت یعنی ہندوؤں کی حکومت ہونگے۔ مگر اس سے بڑھ کر کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ بات درست ہو۔ تو میں تو اسے سوراج کہنے سے بھی منکر ہوتا ہُوا اپنی ساری طاقت سے اس کی مخالفت کروں گا۔ میرے لئے سوراج کے معنے لوگوں کی اور انصاف کی حکومت ہیں۔ ایسے راج میں خواہ ہندو خواہ مسلمان یا سکھ ہوں۔ اور مجلس واضع قوانین خواہ بالکل ہی ہندوؤں یا مسلمانوں یا کسی اور جماعت کے افراد سے پُر ہو۔ بلا لحاظ رعایت انصاف ہی ہُوا کرے گا۔

اگر سوراج کا مقصد ہمیں مہذب بنانا اور ہماری تہذیب کو پاکیزہ اور مستحکم بنانا نہ ہو۔ تو وہ محض بے قدر ہوگا۔ ہماری تہذیب کا اصلی جوہر یہ ہے کہ ہم شخصی یا خاص عام کے کل معاملات میں اخلاق کو ایک مستقل جگہ دیتے ہیں۔

سوراج کی طرف یاترا کرتے وقت ایک کٹھن گھاٹی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اس میں تفصیلات کی طرف توجہ درکار ہوتی ہے۔ اس سے مراد وسیع قوت ناظمہ اور دیہات میں صرف دیہات کی خدمت کی غرض سے گھسنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی قومی تعلیم یا عوام کی تعلیم ہیں۔ اس سے مراد عوام میں قومی شعور کی بیداری ہے۔ یہ جادوگر کے آم کی مانند تیار ہونے کا نہیں۔ یہ بڑ کے درخت کی مانند نامعلوم طور پر نشوونما پاسکے گا۔ ایک خونریز انقلاب کبھی یہ کارنامہ نہیں دکھلا سکیگا۔ یہاں جلدبازی نہائیت یقینی طور پر تضیع و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

میرے لئے سوراج کے معنی ہمارے ملک کے ادنےٰ سے ادنےٰ باشندے کو بھی آزادی نصیب ہونا ہیں۔ میں صرف انگریزوں کے جوئے سے ہندوستان کو آزاد کرانے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں ہندوستان کو ہر ایک قسم کے جوئے سے مخلصی دلانا چاہتا ہوں میں ایک برائے نام بادشاہ کے بدلے دوسرا برائے نام بادشاہ نہیں چاہتا۔

سودیشی سے میری کیا مراد ہے؟

میری سودیشی کی تعریف کو سبھی جانتے ہیں۔ مجھے اپنے قریب ترین پڑوسی کے خرچ پر اپنے دور کے پڑوسی کی خدمت کرنا ہرگز منظور نہیں۔ میری سودیشی تحریک ہرگز قصاصی یا تعزیری نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی طرح سے تنگ دلانہ ہے۔ کیونکہ جو کچھ بھی میری نشو و نما کے لئے درکار ہے۔ میں اسے دنیا کے ہر حصے سے خرید لیتا ہوں۔ اگر کوئی شئے میری بالیدگی میں مانع ہو یا اسے ضرر پہنچاتی ہو جسے فطرت نے میری سب سے پہلی خبرگیری کا مستحق بنایا ہے۔ تو خواہ وہ کتنی ہی نفیس یا خوبصورت ہو۔ اسے میں کسی سے بھی خریدنے کے لئے تیار نہ ہونگا۔ میں مفید اور صحت بخش کتب کو دنیا کے ہر حصے سے خریدتا ہوں۔ انگلینڈ سے آلات جراحی، آسٹریلیا سے پن اور پنسلیں اور سوئٹزرلینڈ سے گھڑیاں خریدا کرتا ہوں۔ مگر میں انگلستان یا جاپان یا کسی اور ملک سے نہایت ہی نفیس سوتی کپڑے کا ایک انچ بھی نہیں خریدوں گا۔ کیونکہ اس بات نے ہندوستان کے لکھوکھا باشندوں کو نقصان پہنچایا ہے اور متواتر نقصان پہنچا رہی ہے۔ میں اسی امر کو اپنے لئے گناہ خیال کرتا ہوں۔ کہ میں ہندوستان کے لاکھوں غریبوں کے ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے خریدنے سے انکار کرکے بدیشی کپڑا خریدوں۔ خواہ وہ ہندوستانی ہاتھوں سے بنے ہوئے کپڑے سے اپنی صفت میں کتنا ہی برتر کیوں نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ میری سودیشی تحریک زیادہ تر ہاتھ سے بنے ہوئے کھدر پر مرکوز ہوتی ہوئی اس ہر ایک شئے کی طرف وسعت پذیر ہوتی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے یا کی جا سکتی ہے۔

سودیشی کو اختیار کرنا تیاگ (ترک) کا پہلا قدم ہے

سودیشی تحریک ہر مرد۔ عورت اور بچے کو پاکیزہ قسم کی خود ایثاری شروع کرنے کا موقعہ پیش کرتی ہے۔

کسی دستکاری کے ہندوستانی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاف اور اعلانیہ طور پر عوام کے مفاد کے لئے ہو۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ اس میں ہنرمند یا بے ہنر ہندوستانی لوگ کام کرتے ہوں۔ اس کا سرمایہ اور مشینری بھی ہندوستانی ہو۔ اور اس میں جو مزدور کام کریں۔ انہیں گذارے کے قابل مزدوری دے کر آرام کے ساتھ مکانوں میں رکھا جائے۔ جبکہ آجر لوگ ان کے بچوں کی بہبودی کے ضامن ہوں۔ یہی ایک معیاری تعریف ہے۔

سودیشی وہ قانونوں کا قانون ہے۔ جسے عہد حاضرہ نافذ کرتا ہے۔ روحانی قوانین۔ قدرتی قوانین کی مانند ہمارے لفظوں پر انحصار نہیں رکھتے۔ وہ خود بخود نافذ ہوا کرتے ہیں۔ لیکن جہالت یا دیگر اسباب کے ماتحت انسان اکثر اوقات ان کی پروا

نہیں کرتا۔ یا ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ایسی حالت میں ہی ہمیں اپنی روش پر برقرار رہنے کے لئے عہد کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ایک شخص جو طبعاً ہی سبزی ترکاری کھانے والا ہے۔ اسے اپنی اس عادت کی تقویت کے لئے عہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ کیونکہ حیوانی خوراک کا دیکھنا ہی اس کے اندر ترغیب پیدا کرنے کی بجائے اس کی کراہت کو ابھارتا ہے۔ سودیشی کا قانون انسان کی بنیادی فطرت میں رما ہوا ہے مگر آج وہ فراموشی کی تاریکی میں ڈوب رہا ہے۔ اپنے اصلی اور روحانی معنوں میں سودیشی سے مراد انسانی روح کا ذہنی قید سے نجات حاصل کرنا ہے۔ چونکہ یہ خاکی گھر اس کا قدرتی اور مستقل مسکن نہیں ہے۔ یہ اس کے پیشرو سفر میں رکاوٹ ہو کر دوسروں کے ساتھ اس کی وحدت کے احساس میں حائل ہو رہا ہے۔ اس لئے سودیشی کا حامی کل مخلوقات کے ساتھ رشتہ وحدت قائم کرنے کے خیال سے مادی جسم کی قید سے نجات پانا چاہتا ہے۔

اگر سودیشی کی یہ تعبیر درست ہو۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا پیروکار اپنے قریبی پڑوسیوں کی خدمت میں اپنا فرض اولین دیکھنے والا ہوگا۔ بے شک اس عمل میں دوسروں کے مفاد کا اخراج یا قربانی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ اخراج اور قربانی صرف ظاہری ہے اپنے پڑوسیوں کی خالص خدمت اپنی ذات میں کبھی دور دراز کے لوگوں کے حق میں نقصان رساں نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے خلاف جس طرح فرد کے ساتھ۔ اسی طرح کل جمات کے ساتھ ایک ایسا بے خطا اصول ہے۔ جو دل میں بٹھا لینے کے لائق ہے۔ دوسرے پہلو پر جو شخص دور کے نظارے پر فریفتہ ہو کر خدمت کرنے کے خیال سے زمین کی انتہاؤں کی طرف دوڑا کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے مقصد میں ناکامیاب رہتا ہے بلکہ اپنے پڑوسیوں کی طرف اپنا فرض ادا نہیں کر سکتا۔ ایک مفروضہ مثال لیجئے۔ وہ خاص جگہ جہاں میں رہتا ہوں۔ وہاں کئی اشخاص میرے پڑوسی رشتہ دار اور ملازمین رہتے ہیں۔ قدرتی طور پر وہ سب کے سب محسوس کرتے ہیں جیسا کہ ان کا حق ہے کہ وہ مجھ

پر حق رکھتے ہیں۔ اور مدد اور سہائتا کیلئے میری طرف دیکھا کرتے ہیں۔ اب فرض کرو کہ میں ان سب کو چھوڑ کر لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ تب میرے اس فیصلے سے میرے پڑوسیوں اور ملازمین کی چھوٹی سی دُنیا کی حالت بگڑ جائے گی۔ جبکہ میری خواہ مخواہ کی خدائی فوجداری غالباً نئی جگہ کے کرۂ ہوائی میں خلل انداز ہونے کے سوا اور کوئی اثر نہ رکھے گی۔ اس طرح پہلے اپنے قریبی پڑوسیوں کی خدمت میں مجرمانہ غفلت اور ان لوگوں کا خواہ مخواہ کا نقصان جن کی میں خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اصول سودیشی کی خلاف ورزی کے نتائج اوّلیہ ہوں گے۔ اس قسم کی بہت سی مثالوں کو پیش کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اسی لئے گیتا کہتی ہے "اپنے سودھرم یعنی اپنے فرض کو ادا کرتے ہوئے جان دے دینا بہتر ہے۔ پر دھرم یا دوسرے کا فرض پرُ از خطرات ہوا کرتا ہے۔" اگر اس قول کی اپنے جسمانی ماحول کی اصطلاحات میں تعبیر کی جائے۔ تو یہ سودیشی کا قانون بتلاتا ہے۔ گیتا جو کچھ سودھرم کے متعلق کہتی ہے۔ وہی کچھ سودیشی پر بھی ہو بہو صادق آتا ہے۔ کیونکہ وہ سودھرم ہے۔ جو ہمارے قریبی ماحول پر عائد ہوتا ہے۔

ہاں جب سودیشی کے مسئلے کی غلط تعبیر کی جاتی ہے۔ تب ہی مضر نتائج نکلتے ہیں۔ مثلاً اگر میں اپنے کنبے کی ناز برداری کے لئے جائز و ناجائز طریقہ سے روپیہ چھیننے لگ جاؤں۔ تو یہ سودیشی کی سراسر تضحیک ہی ہوگی۔ سودیشی کا قانون مجھ سے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں چاہتا۔ کہ میں جائز وسائل سے اپنے کنبے کے متعلق اپنے واجبی فرائض کو ادا کروں۔ اور ایسا کرنے کی کوشش مجھ پر چال چلن کا عالمگیر اصول روشن کر دے گی۔ سودیشی بیکار نہ ہوتا کسی کے لئے کبھی ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی دوسرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو سودیشی کی بجائے میری خود غرضی مجھے متحرک کر رہی ہے۔

ایسے مواقع بھی پیش آسکتے ہیں۔ جبکہ سودیشی کے پیروکار کو عالمگیر خدمت کی قربان گاہ پر اپنا کنبہ ہی نذر کرنا پڑے۔ ایسا رضاکارانہ ایثار اپنے کنبے کے حق میں اعلےٰ ترین خدمت ہوگا۔

"جو شخص اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ اسے کھو بیٹھیگا۔ اور جو اسے مالک کی خاطر کھو دیتا ہے۔ وہ اسے پائیگا۔"

یہ مقولہ فرد کی مانند کنبے پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک اور مثال لو۔ فرض کرو میرے گاؤں میں پلیگ پھیل جاتی ہے۔ اور اس وبا میں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے میں۔ میری عورت اور بچے اور باقی سارا کنبہ زندگی کھو بیٹھتا ہے تب اپنے خویش و اقربا کو اس خدمت کی طرف راغب کرتا ہوا میں اپنے کنبے کو تباہ کرنے والا ہونے کی بجائے اس کا نہایت حقیقی محب ہوں گا۔ سودیشی میں خود غرضی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اگر اس میں خود غرضی موجود ہوتی ہے۔ تو وہ ایسی اعلےٰ ترین قسم کی ہوتی ہے جسے خود ایثاری سے تمیز نہیں کر سکتے۔ سودیشی اپنی پاکیزہ ترین صورت میں عالمگیر خدمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسی استدلال کی پیروی کرتے ہوئے ہی مجھے سوسائیٹی میں اصول سودیشی کے ضمنی نتیجے کے طور پر کھادی کا خیال سوجھ آیا۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا۔ "کونسی خدمت ہے۔ جس کی آج ہندوستان کے لکھو کھا باشندوں کو اشد ضرورت ہے۔ اور جسے آسانی کے ساتھ سمجھنا اور جانچنا شکل ہے۔ جو باسانی ہو سکتی ہے۔ اور جو بھوک سے ادھ موئے کروڑوں باشندگان ملک کو جینے کے قابل بنائے گی؟ اور مجھے یہی جواب ملا ہے کہ کھادی یا چرخے کا عالمگیر رواج ہی ان شرائط کو پورا کر سکتا ہے۔"

"کسی شخص کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ کھادی کے معنے سودیشی کی ہیری

بیرونی ملکوں کے مِل اونرز کو نقصان پہنچائے گی۔ جب کسی چور کو چوری سے ہٹایا جاتا ہے یا چرایا ہوا مال واپس کرنے کے لئے اسے مجبور کیا جاتا ہے۔ تو اس سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کے خلاف وہ ایک حالت میں دانستہ طور پر اور دوسری حالت میں نادانستہ طور پر فیضیاب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر دنیا بھر کے افیون اور شراب کھانے اور پینے والے لوگ اپنی برائیوں کو چھوڑ دیں۔ تب شراب اور افیون بیچنے والے لوگ اپنے گاہکوں سے محروم ہو کر بھی نقصان اٹھانے والے نہ سمجھے جائیں گے۔ بلکہ وہ سچے معنوں میں نفع اٹھانے والے ہوں گے۔ پاپ کی سزاؤں کا گھٹ جانا نہ تو فرد کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اور نہ سوسائٹی کے لئے۔ بلکہ خالص نفع ہوتا ہے۔

یہ خیال کرنا بڑے سے بڑا دھوکہ ہے کہ سودیشی کا فرض کسی طرح سوت کاتنے اور اس سے بنا ہوا کپڑا پہننے پر ختم ہو جاتا ہے۔ کھادی تو سوسائٹی کی طرف سودیشی دھرم نبھانے کا پہلا قدم ہی ہے۔ ہم ایسے لوگ دیکھ پاتے ہیں۔ جو کھادی پہنتے ہوئے باقی سب امور میں ودیشی چیزوں کے لئے اپنے شوق کو نہایت شدت کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سودیشی کے اصول پر کاربند نہیں کہا جا سکتا۔ وہ صرف ایک فیشن کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ سودیشی کا پیروکار بڑی احتیاط سے اپنے ماحول کا مطالعہ کرتا ہوا جہاں کہیں موقع پائے گا۔ مقامی صنعت کی پیداواروں کو ترجیح دیتا ہوا اپنے پڑوسی کی مدد کرنے کے لئے کوشاں ہوگا۔ اگرچہ وہ پیداواریں ان چیزوں کی بہ نسبت ادنیٰ صنعت یا گراں قیمت بھی ہوں۔ جو اور جگہ تیار ہوتی ہیں۔ وہ ان کے نقائص دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر ان کے نقائص کی وجہ سے انہیں ترک کر کے ودیشی اشیاء نہ لے گا۔

لیکن اگر سودیشی کو ایک معبود کی مانند تصور کیا جائے۔ تب سودیشی بھی موت کی طرف لے جانے والی ہوگی۔ یہ ایک خطرہ ہے۔ جس سے بچ کر رہنا ضروری ہے۔

غیر ملکی پیداواروں کو اس لئے ترک کرنا کہ وہ غیر ملکی ہیں اور وقت اور روپے کو ان دستکاریوں کی ترقی کے لئے خرچ کئے جانا جن کے لئے اپنا ملک موزونیت نہیں رکھتا۔ مجرمانہ حماقت اور سودیشی کی روح کا خاتمہ ہے۔ سودیشی کا سچا پیروکار کبھی غیر ملک کے باشندوں کا بدخواہ نہ ہوگا۔ وہ زمین پر کسی کے لئے بھی مخالفت سے متحرک نہ ہوگا۔ سودیشی تحریک نفرت کا مسلک نہیں ہے۔ یہ بےغرضانہ خدمت کی وہ تعلیم ہے۔ جو اہنسا یعنی محبت میں اپنی اصل رکھتی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد آخر میں سودیشی کی تعریف کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ جو میرے مطلب کو شاید بہترین طور سے واضح کرتی ہے۔ سودیشی ہماری وہ اندرونی روح ہے جو ہمیں اپنے قریبی ماحول کی خدمت اور بہتری میں مصروف رکھتی ہوئی بعید تر ماحول کو خارج کرتی ہے۔ چنانچہ مذہب کے معاملہ میں اس تعریف کی شرائط کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ میں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب ہی پر محدود رہتا ہؤا اپنے قریبی مذہبی ماحول کو استعمال کروں۔ اگر میں اس میں نقائص دیکھوں تو میرا فرض ہوگا۔ کہ اسے ان نقائص سے پاک کروں۔ دائرہ سیاسیات میں مجھے ملکی اداروں کا استعمال کرتے ہوئے انہیں ان کے مسلمہ نقائص سے صاف کرنا ہوگا۔ اقتصادیات میں مجھے صرف وہی چیزیں استعمال کرنی ہونگی۔ جو میرے قریبی پڑوسی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور ان دستکاریوں میں جو کمی نظر آئے۔ انہیں دور کر کے انہیں کارآمد بنانا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر سودیشی کو عمل میں لایا جائے۔ تو وہ عہد سعادت لانے کا موجب ہوگا۔ اور چونکہ ہم عہد سعادت کو حاصل کرنے پر بھی اس کا تعاقب نہیں چھوڑیں گے کیونکہ اس پر ہم اپنے زمانے میں رسائی حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اسی طرح پر ہم سودیشی کو بھی ترک نہیں کریں گے۔ اگرچہ یہ آئندہ نسلوں تک بھی پورے طور پر حاصل نہ ہو سکے گا۔

یہ کہنا کہ اپنے اثر کے لحاظ سے بھی بائیکاٹ اور سودیشی ایک ہی شے ہیں۔

ظاہر کرتا ہے کہ دونوں کو ہی سمجھا نہیں گیا۔ سودیشی ایک ابدی اصول ہے جس سے غفلت نوع انسان کے لئے بے انداز دکھ کا موجب ثابت ہوئی ہے۔ اس کے معنی اپنے ملک میں تیار شدہ اشیاء کی پیدائش اور تقسیم ہے۔ اور اپنی تنگ اور موجودہ حالت میں اس سے مراد کاشتکار آبادی کی راہ سے سالانہ ساٹھ کروڑ روپے کی بچت ہے اس لئے اس کے معنی بہتر فیصدی آبادی کے لئے ایک بہت ضروری مزید دستکاری مہیا کرنا ہیں۔ سودیشی ایک تعمیری پروگرام ہے۔ اس کے خلاف بائیکاٹ ایک عارضی تدبیر ہے۔ جو اہل برطانیہ کو روپے پیسے کا نقصان پہنچا کر انہیں اپنی بات منوانے پر مجبور کرنا چاہتی ہے اس لئے بائیکاٹ ایک غیر مناسب اثر کے طور پر جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کام کرتا ہے۔

برہمچریہ

انسانی سوسائیٹی ایک لگاتار نشوونما اور ایک ظہور روحانیت ہے۔ اگر ایسا ہو۔ تب جسم کے مطالبات پر ترقی پذیر ضبط کا ہونا ضروری ہے۔ اس نظریہ سے شادی وہ عہد و پیمان ہے۔ جو طرفین پر ضبط عائد کرتا ہوا صرف ان کے درمیان جسمانی ملاپ کی اجازت اس لئے دیتا ہے کہ وہ اولاد پیدا کر سکیں۔ جب کہ طرفین اس کے لئے خواہش مند اور تیار ہوں۔ کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔

شادی زندگی میں ایک فطری شے ہے اور اسے کسی معنوں میں بھی گرنے والی شے خیال کرنا بالکل غلط ہے۔ اس کا معیار یہ ہے۔ کہ اسے ایک متبرک عہد و پیمان جانتے ہوئے۔ شادی شدہ حالت میں خود ضبطی کی زندگی بسر کی جائے۔

زمانہ حال کی بہت سی مصائب سے بچنا ممکن ہے بشرطیکہ ہم جنسی تعلق کو صحت بخش اور پاک روشنی میں دیکھنے کے قابل ہو کر خود کو آنے والی نسلوں کی اخلاقی بہتری کے لئے ٹرسٹی خیال کرتے ہوں۔

ترکِ مطلق یا قطعی برہم چریہ ایک معیاری حالت ہے۔ اگر تم اسی معیار پر پہنچنے کا خیال نہیں کر سکتے۔ تو بے شک شادی کر لو۔ لیکن اس حالت میں بھی خود ضبطی کی زندگی بسر کرنا سیکھو۔

شادی کا معیار وہ نصب العین ہے جسے شادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جسم کی راہ سے روحانی ملاپ ہے۔ اور وہ انسانی محبت جو یہ ادارہ ظاہر کرتی ہے۔ ایزدی یا عالمگیر محبت کا وسیلہ ہونے کے لئے ہے۔

جو بات انسان کو سب سے بڑھ کر حیوان سے تمیز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ انسان اپنی سمجھ بوجھ کی عمر سے ہی لگاتار۔ خود ضبطی کی زندگی بسر کرنے لگ جاتا ہے۔ خدا نے انسان کو بہن اور اپنی ماں۔ اپنی لڑکی اور اپنی بیوی کے درمیان تمیز کرنے کے قابل بنایا ہے۔

میری رائے میں خیال۔ تقریر اور عمل میں پورا برہم چریہ روحانی کمال کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ اور جو قوم اپنے درمیان ایسے اشخاص نہیں رکھتی۔ وہ اس کمی کے باعث مفلس ہی ہے۔

جسمانی تسلی کے لئے جنسی مباشرت کے معنی حیوانیت کی طرف لوٹنا ہیں اور اس لئے انسان کو اس سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ایسا کرنے میں ناکامیابی ہو۔ تو اسے گناہ یا بدگوئی کا معاملہ نہیں سمجھا جاتا۔ اس دنیا میں لاکھوں انسان صرف اپنے حلق کی لذت کے لئے ہی کھایا کرتے ہیں۔ اور اسی طرح لاکھوں خاوند اور بیویاں اپنی جسمانی تسلی کے لئے جنسی عمل کا شوق پورا کرتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح عمل کرتے ہوئے ان بے شمار بیماریوں کے شکار ہونے کی وہ اٹل سزائیں بھگتیں گے جو فطرت اپنے قوانین کی خلاف ورزی کے عوض میں دیا کرتی ہے۔ مطلق برہم چریہ یا منکوحہ برہم چریہ ان لوگوں کے لئے ہے۔ جو روحانی یا اعلیٰ زندگی کے طالب ہیں۔ یہ ایسی زندگی کے لئے نہایت لابدی ہے۔

بیوی اپنے خاوند کی زر خرید غلام ہونے کی بجائے اس کا ساتھی۔ معاون اور اس کی خوشی شریک اور غموں میں مساوی طور پر حصہ دار اور اپنا راستہ چننے کے لئے خاوند کی مانند ہی آزاد ہے۔

منو نے سب سے پہلے پیدا ہونے والے بچے کو دھرم یعنی احساس فرض سے پیدا شدہ اور اس کے بعد پیدا ہونے والے بچوں کو کام یعنی شہوانی طور پر پیدا شدہ بتلایا ہے۔ یہ بات جنسی تعلقات کے قانون کا لب لباب بیان کرتی ہے۔ اور خدا ہی تو قانون ہے اور خدا کی اطاعت سے مراد قانون کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تمہیں اپنی عورت کی عزت کا محافظ اور اس کا مالک ہونے کی بجائے اس کا سچا رفیق ہونا واجب ہے۔ تم اس کے جسم اور روح کو ایسا ہی مقدس تصور کرو گے جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے جسم اور روح کو متبرک خیال کرے گی۔ اس غرض کے لئے تمہیں عبادت گذار، محنت، سادگی اور خود ضبطی کی زندگی بسر کرنی ہوگی۔ تم میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کا ذریعہ شہوت نہیں سمجھنا چاہیئے۔

برہمچریہ سے مراد تمام حواس اور اعضا پر مکمل قابو پانا ہے۔ مکمل برہمچاری کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ مگر یہ ایک معیاری حالت ہے۔ جو شاذ و نادر ہی حاصل ہوتی ہے برہمچریہ کو خیال، الفاظ اور عمل میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ بات تمام پابندیوں اور فرائض پر صادق آتی ہے۔ گیتا میں بتلایا گیا ہے۔ اور ہمارا تجربہ اس کے بیان کی تائید کرتا ہے کہ احمق انسان جو جسم کو قابو میں رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اپنے ذہن میں برے خیالات کا حظ اٹھایا کرتا ہے۔ وہ ایک بے سود کوشش میں مصروف ہوتا ہے جسم کو مغلوب کرنا نقصان دہ ہے۔ اگر ذہن کو بیک وقت گمراہ ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ من جہاں بھی جاتا ہے۔ وہاں جسم کو بھی جلدی یا بدیر جانا ہی پڑے گا۔ یہاں پر ایک فرق کو ضرور سمجھ لینا ضروری ہے۔ من کو برے خیالات سوچنے کی اجازت

دینا ایک بات ہے - اور یہ بالکل ہی دوسری بات ہے کہ باوجود ہماری کوشش کے وہ بُرے خیالات کی طرف دوڑتا ہو - اگر ہم اس بُرے عمل میں من کے ساتھ عدم تعاون کریں تو انجام کار ہماری فتح ہوگی - ہم زندگی کے ہر لمحہ میں تجربہ کرتے ہیں - کہ اکثر دفعہ جب ہمارا جسم ہمارے قابو میں ہوتا ہے - من بے قابو ہوتا ہے - اس لئے جسم کو فوراً قابو پا کر من کو بس میں لانے کے لئے لگاتار کوشش کرنی چاہئیے - ہم اس سے کم یا بیش کچھ نہیں کر سکتے - اگر ہم من کو کھلی چھٹی دے دیں تب جسم اور من مختلف سمتوں میں کھینچا تانی کرنے لگیں گے - اور ہم اپنے حق میں جھوٹے ثابت ہو جائیں گے - جسم اور ذہن اس وقت تک ہی اکٹھے چل سکتے ہیں - جب کہ ہم ہر ایک بُرے خیال کی آمد کو روکنے کے لئے اپنی مزاحمت جاری رکھتے ہیں -

برہم چریہ کو نبھانا ایک بہت مشکل بلکہ ناممکن کام سمجھا گیا ہے - اس عقیدے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم دیکھ پاتے ہیں - کہ لفظ برہمچریہ کو بہت تنگ لفظوں میں برتا گیا ہے - صرف حیوانی شہوت پر قابو پانے کو ہی برہمچریہ سمجھ لیا گیا ہے - میرے خیال میں یہ تصور نا ممکن اور غلط ہے - برہمچریہ سے مراد کل حواس پر غلبہ ہے - جو شخص صرف ایک حس پر قابو پاتا ہے اور دوسرے حواس کو کھلی چھٹی دیتا ہے - اس کی کوشش رائیگاں جائے گی - کانوں سے گندی حکایات کا سُننا - آنکھوں سے گندے خیالات اُبھارنے والے نظاروں کو دیکھنا - زبان سے بھڑکانے والی خوراک کھانا اور ہاتھوں سے اشتعال دینے والی چیزوں کو چھونا اور اس کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ حس کو قابو میں لانے کی کوشش ایسی ہی بے سود ہے - جیسے کہ آگ میں ہاتھ ڈال کر جلنے سے بچے رہنے کی کوشش فضول ہے اس لئے جو شخص ایک حس پر غالب آنا چاہتا ہے - اس کے لئے ضروری ہے کہ بقیہ حواس پر بھی غالب آنے کے لئے کوشاں ہو - میں ہمیشہ دیکھتا رہا ہوں کہ برہمچریہ کا تنگ تصور بہت مضر ثابت ہوتا ہے - اگر ہم تمام پہلوؤں میں ہر وقت خود ضبطی کی مشق کریں -

تب یہ کوشش سائنٹیفک اور سہولت کامیاب ہوگی۔ شاید حلق سب سے بڑا گنہگار ہے۔ اس لئے ہم نے فرائض میں اسکے لئے ایک جداگانہ جگہ مقرر کی ہے۔

ہمیں برہمچریہ کے لغوی معنی یاد رکھنے چاہئیں۔ برہمچریہ کے لئے وہ طرز عمل ہے جو برہم یعنی سچائی کی کھوج کے لئے اختیار کیا جائے۔ ان لغوی معنوں سے برہمچریہ کے خاص معنوں یعنی "کل حواس پہ غالب آنے" کا ظہور ہوتا ہے۔ ہمیں اس کے محض تنگ پہلو کو بالکل ہی فراموش کر دینا چاہیئے۔ جو خود کو صرف جنسی پہلو پر ہی محدود رکھتا ہے۔

برہمچریہ کے معنی صرف جسمانی ضبط ہی نہیں ہیں۔ اس کے معنی وسیع تر ہیں۔ اس سے مراد کل حواس پر قابو پانا ہے۔ چنانچہ ایک ناپاک خیال برہمچریہ کی خلاف ورزی ہے۔ یہی حال غصے کا ہے۔ کل طاقت اس قوت حیات کے تحفظ اور تلطیف سے حاصل ہوتی ہے۔ جو زندگی کی پیدائش کے لئے ذمہ دار ہے۔ اگر قوت حیات کو بکھیر دینے کی بجائے اس کا تحفظ کیا جائے۔ تب یہ نہائیت ہی اعلےٰ درجے کی تخلیقی طاقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ قوت حیات برے خیالات اور بلکہ بے ترتیب اور غیر مطلوب خیالات کی راہ سے لگاتار اور ہماری بے خبری میں ضائع ہو رہی ہے۔ اور چونکہ خیال ہی تقریر اور عمل کی جڑ ہے۔ تقریر اور عمل کی صفت خیال کی صفت کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ اس لئے منضبط خیال ہی بذات خود ایک نہائیت مؤثر طاقت ہے۔ اور وہ خود بخود عمل پذیر ہو سکتا ہے۔ یہ طاقت اس شخص کے لئے ناقابل حصول ہے۔ جو ہر طریقے سے اپنی طاقت کو ضائع کیا کرتا ہے۔ ایک سوراخ دار نالی میں بھری ہوئی بھاپ کوئی طاقت نہیں دے سکتی جنسی عمل کو عمداً اولاد پیدا کرنے کے مقصد سے جدا کرنا شہوت پرستی کی ایک کثیف اور نمونے کی مثال پیش کرتا ہے۔ اور اس لئے خاص اور جائز طور پر اس کی مذمت کی گئی ہے۔ مگر وہ شخص جو عوام الناس کو غیر مطلوب

عمل کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے۔ اُسے مذکورہ بالا قسم کے پورے ضبط کے لئے کوشاں ہو کر اسے واقعی طور پر حاصل کرنا ہوگا۔

کہا گیا ہے کہ برہمچریہ کو صرف غاروں میں بسنے والے لوگ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ برہمچاری کو کبھی عورت کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ اسے چھونے کا ذکر تو درکنار۔ بیشک ایک برہمچاری عورت کے متعلق پُر شہوت طریق سے کبھی نہ تو سوچا کرتا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق ذکر کرتا۔ دیکھتا یا اس سے چھوتا ہے ......

...... اگرچہ اس شخص کے لئے برہمچریہ کے اصول پر کاربند رہنا مشکل ہے۔ جو دنیا کے ساتھ کھلم کھلا میل جول رکھتا ہے۔ لیکن وہ برہمچریہ بھی بہت اہمیت نہیں رکھ سکتا۔ جو دنیا سے کنارہ کش ہونے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

مَیں اپنی ساری طاقت کے ساتھ یہ اعلان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ خاوند اور بیوی کے درمیان بھی شہوت پرستانہ کوشش ایک غیر قدرتی شے ہے۔ شادی کا مقصد جوڑے کے دلوں کو ناپاک جذبات سے پاک کر کے انہیں خدا کے قریب تر لانا ہے۔ خاوند اور بیوی کے درمیان خالی از شہوت محبت ناممکنات میں سے نہیں ہے انسان حیوان نہیں۔ وہ حیوانی مخلوقات میں بے شمار جنم لینے کے بعد انسانی بلندی تک مرتفع ہوا ہے۔ وہ کھڑا ہونے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ چوپاؤں کی مانند چلنے یا رینگنے کے لئے نہیں۔ حیوانیت انسانیت سے اسی طرح ہی دُور کی شے ہے۔ جیسے کہ مادہ روح سے۔

مَیں مانتا ہوں۔ کہ شادی مذہب کے حق میں باڑ ہے۔ اگر اس باڑ کو گرا دیا جائے تب مذہب بھی چکنا چور ہو جائے گا۔ مذہب کی بنیاد خود ضبطی ہے اور شادی خود ضبطی کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص ضبط سے بے بہرہ ہے۔ وہ کشف ذات کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ میں معترف ہوں۔ کہ ایک ملحد یا مادہ پرست کے روبرو ضبط کی ضرورت کو ثابت

کو جاننا مشکل ہوگا۔ مگر جو شخص جسم کی فانی فطرت کو روح کی غیر فانی فطرت سے تمیز کرتا ہے۔ وہ جلدی ہی سمجھ جاتا ہے کہ خود ضبطی اور تہذیب نفس کے سوا کشف ذات کا امکان نہیں ہے۔ یہ جسم یا تو شہوت کی بازی گاہ ہوگا۔ یا کشف ذات کا مندر بنے گا۔ بحیثیت ثانی اس بات میں عیاشی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ روح ہر لمحہ جسم کو دبا کر رکھیگی۔

یہ بات کہ جنسی تعلق کا مقصد صرف اولاد پیدا کرنا ہے۔ اپنی نوعیت میں میرے لئے ایک جدید دریافت ہے۔ میں نے پہلے کبھی اس بات کو وہ اہمیت نہ دی تھی۔ جس کی یہ مستحق ہے۔ میں اسے قریب ماضی تک ایسے ایک زاہدانہ خواہش ہی سمجھتا رہا ہوں۔ مگر اب میں اسے شادی شدہ حالت کا بنیادی قانون خیال کرتا ہوں۔ جس پر کاربند ہونا آسان ہے بشرطیکہ اس کی برتر اہمیت کو اچھی طرح سے جان لیا جائے۔ میرا مقصد اس وقت پورا ہوگا۔ جب کہ اس قانون کو سوسائٹی میں مناسب جگہ دی جائیگی۔ میری نظر میں یہ ایک زندہ قانون ہے۔ ہم ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کے لئے سخت سزا بھگتا کرتے ہیں۔

میرا برہمچریہ

میں نے دنیا کے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے تیس سال سے زیادہ عرصہ کے لئے کافی کامیابی کے ساتھ برہمچریہ کا پالن کیا ہے۔ برہمچریہ کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد میری بیوی کے ساتھ میرے تعلق کے سوا میرے اور کسی بیرونی عمل میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

میں نے اپنا برہمچریہ کتابوں سے نہیں سیکھا۔ میں نے اپنی اور ان لوگوں کی رہنمائی کے لئے جو میری دعوت پر اس تجربہ میں میرے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ خود ہی قواعد وضع کئے تھے۔ اگر میں نے مروجہ قواعد کی پابندی نہیں کی۔ تو اس سے کمتر میں نے اس بیان کو درست تسلیم کیا ہے جو شاستروں میں پایا جاتا ہے۔ اور جو عورت کو ہی کل بدی اور ترغیب کا چشمہ بتلاتا ہے۔ چونکہ میرے اندر جس قدر نیکی موجود ہے۔ وہ میری ماں کی طرف سے ہے۔ میں عورت کو جنسی خواہش کی تسلی کا ایک ذریعہ خیال کرنے کی بجائے اسی احترام کی نگاہ سے دیکھتا

رہا ہوں۔ جو کہ میں اپنی ماں کے لئے محسوس کرتا ہوں۔ مرد ہی بھٹکانے اور پہل کرنے والا ہے۔ عورت کا لمس فرد کو ناپاک نہیں بناتا۔ بلکہ مرد خود ایسا ناپاک ہے۔ کہ وہ عورت کو چھونے کا حق نہیں رکھتا۔

میں تجربہ کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا۔ کہ میں نے اپنے تصور کے مطابق پورا برہمچریہ حاصل کر لیا ہے۔ میں اب تک اپنے خیالات پر وہ ضبط حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جو مجھے عدم تشدد کے بارہ میں تحقیقات کرنے کے لئے درکار ہے۔ اگر میں یہ چاہوں کہ میرا عدم تشدد متعدی اور اثر آفرین ہو جائے۔ تو اس کے لئے مجھے اپنے خیالات پر اور زیادہ قابو پانا ہوگا۔

ہماری آزادی کا جنم اسی دن ہوا۔ جس روز میں نے برہمچریہ پالن شروع کیا۔ میری بیوی آزاد ہو گئی۔ وہ خاوند اور مالک کے طور پر میری حکومت سے نجات پا گئی۔ اور میں اپنی اس شہوانی خواہش سے آزاد ہو گیا۔ جو اسے پوری کرنی پڑتی تھی۔ کوئی اور عورت میرے لئے وہ کشش نہ رکھتی تھی۔ جو کہ میری بیوی میرے لئے رکھتی تھی۔ میں بطور خاوند کے اپنی عورت کے ساتھ اور اپنی ماں کے روبرو اپنے عہد کے حق میں اتنا وفادار تھا۔ کہ کسی اور عورت کا غلام نہ بن سکتا تھا۔ مگر برہمچریہ مجھے جس طریق سے حاصل ہوا ہے۔ اس نے مجھے عورت کی طرف مادرِ انسان کے طور پر کھینچنا شروع کیا۔ اور وہ میرے لئے اسی قدر معزز ہو گئی۔ کہ اب اس تقدس کو جنسی محبت چھو ہی نہیں سکتی۔ اور اسی طرح ہر ایک عورت میرے لئے بیک وقت بہن اور لڑکی ہو گئی ہے ٭

بے خوفی

بے خوفی روحانیت کی پہلی شرط ہے۔ بزدل لوگ کبھی ذی اخلاق نہیں ہو سکتے جب تک ڈر موجود ہے۔ کوئی مذہب (دھرم) نہیں ہے۔

گیتا کا ہر ایک پاٹھک جانتا ہے۔ کہ اس کے سولھویں باب میں بیان کردہ ایزدی صفات کی فہرست میں سب سے پہلے بے خوفی کو جگہ دی گئی ہے۔ آیا یہ بات عروضی ضروریات سے مجبوری کے باعث ہے۔ یا سوچ سمجھ کر بے خوفی کو اتنا بلند مرتبہ دیا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا میری بساط سے باہر ہے۔ مگر میری رائے میں بے خوفی ایزدی صفات میں وہ پہلا درجہ دیئے جانے کے لائق ہے۔ جو غالباً اتفاقیہ طور پر اسے دیا گیا ہے۔ بے خوفی دیگر صفات شریفانہ کے نشو و نما کی ایک لازمی شرط ہے۔ بے خوفی کے بغیر انسان بھلا کیونکر سچائی کا طالب اور محبت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ پریتم نے کہا ہے۔ "ہری (بھگوان) کا مسلک بہادروں کا مسلک ہے۔ بزدلوں کا نہیں۔" یہاں ہری سے مراد سچائی ہے۔

اور وہی شخص بہادر ہیں۔ جو تلوار۔ بندوق یا دیگر جسمانی اسلحہ سے مسلح ہونے کی بجائے
جنہیں بزدل لوگ استعمال کیا کرتے ہیں۔ بے خوفی کا ہتھیار رکھتے ہیں۔

بے خوفی سے مراد بیماری۔ جسمانی ضرر یا موت، بے عزتی، اپنے خویش و اقربا یا شے
کو کھونے، کسی کی ناراضگی وغیرہ تمام بیرونی خوفوں سے آزادی ہے۔

کامل بے خوفی صرف وہی شخص حاصل کر سکتا ہے۔ جس نے پرماتما کو پالیا ہے۔ کیونکہ
بے خوفی میں تمام دکھوں سے نجات مضمر ہوتی ہے۔ مگر ہر ایک شخص مصمم ارادہ لگاتار
کوشش اور خود اعتمادی کی نشوونما کے ذریعے اس مقصد کی طرف ہمیشہ آگے بڑھ سکتا ہے
..... مگر اندرونی دشمنوں کا ہمیشہ ڈر رہنا ہوگا۔ حیوانی شہوت غصے وغیرہ سے ہمارا
ڈرنا عین جائز ہے۔ جب ہم ایک بار اپنے اندرونی غداروں پر فتح پا لیتے ہیں۔ تب
بیرونی دشمن خود بخود ہی رفع ہو جاتے ہیں۔ تمام خوف جسم کو اپنا مرکز بنائے ہوئے اس
کے اردگرد گھوما کرتے ہیں۔ اور جسم کے ساتھ الفت ختم ہوتے ہی کافور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح
ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہر ایک قسم کا خوف ہماری اپنی نظر کی تعمیر کردہ بے بنیاد عمارت کے
سوا کچھ نہیں ہے۔ جب ہم دولت، کنبے اور جسم کے لئے تمام الفت کو خیرباد کہہ دیتے
ہیں۔ تب خوف ہمارے دلوں میں کوئی جگہ نہیں پا سکتا۔ "ان کے ترک سے لطف
اٹھاؤ" یہ ایک اعلیٰ درجے کا فرمان ہے۔ دولت، کنبہ اور جسم جیوں کے تیوں موجود
رہیں گے۔ صرف ہمارا اپنا نقطۂ نگاہ بدل جائے گا۔ یہ تمام چیزیں ہماری نہیں بلکہ خدا کی
ہیں۔ اس دنیا میں کوئی شے بھی ہماری نہیں ہے۔ ہم خود بھی اسی کے ہیں۔ اس لئے ہم
کیوں ڈرا کریں؟ اس لئے اپنشد ہمیں ہدایت کرتی ہے کہ چیزوں سے لطف اندوز ہوتے
ہوئے ان کے ساتھ دل لگی چھوڑ دو۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں ان چیزوں میں مالک کے
طور نہیں بلکہ امین کے طور پر دلچسپی رکھنی چاہئے۔ جس کی خاطر ہم ان چیزوں کا استعمال
کرتے ہیں۔ وہ ہمیں طاقت اور وہ ہتھیار عطا کرے گا۔ جن کے ذریعے ہم انہیں سب حملہ آوروں

سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ اور جب ہم اس طرح ملکیت کا دعوے چھوڑ کر پاؤں تلے خاک کی بہ نسبت بھی زیادہ منکسر خادم ہو جائیں گے۔ تب تمام خوف کہر کی مانند اڑ جائیں گے۔ اور ہم ناقابل بیان اطمینان پا کر ستیہ نارائن (سچائی کے خدا) کو روبرو دیکھ سکیں گے۔

ہم نے اپنی مارچ کے لئے سچائی اور اہنسا کا قدیم مسلک منتخب کیا ہے۔ اب ہمیں خدا کے اس معاہدہ سے عقیدت اور امید حاصل کرنی چاہیئے کہ "جو لوگ ب   رنگ راہ پر قدم زن ہوں گے وہ کبھی غمگین نہ ہوں گے"۔

ہم دھندلکے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ دھندلکا صبح کا ہے یا شام کا۔ ایک کے بعد رات آتی ہے۔ دوسرا دن کی پیش روی کرتا ہے۔ اگر ہم دھندلکے کے بعد اندھی رات کی بجائے چڑھتا ہوا دن دیکھنا چاہتے ہیں تب ہمیں لازم ہے کہ اس مقام اتصال پر سچائی کو پا کر ہر ایک انگلی کے سپاہی جو اس پر برقرار رہیں۔ اور کبھی بھی جس جگہ پر پایا جائے اس کی تبلیغ اور اس پر عمل کریں۔

اس خود مختاری اور شجاعت کے مالک ہیں جو بزدلی سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہم جس قدر بھی سچے اور خود اختیار ہوں تھوڑا ہے۔۔۔۔۔ مگر یہاں منکسر المزاج اور غیر متشدد انسان کی عظیم تر شجاعت جو انسانی یا کسی ایک شخص کو بھی فرد واحد کے خیال کے بغیر پھانسی پر چڑھنے کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ چاہتا ہوں۔

اس سے یہ کہ کوئی بہادری نہیں ہے کہ ہم کسی زمینی طاقت کے خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو۔ حکومت کے بغیر اور اس عقیدت کاملہ کے ساتھ کہ روح جیتی ہے کوئی فتح نہیں۔ گھٹنے ٹیکنے سے ہم انکار کرنے کے منکر ہوں۔

طاقت اور شجاعت اور عقل کی مقابلے کی ترکیب جسم پر ہوں۔ حقیقی بہادری پائی جاتی ہے۔ بے خوفی کے بغیر عدم تشدد ناممکن ہے۔ معاف کر دینا بہادری کی صفت ہے اور اہنسا عفو کی آخری حد ہے۔

جب ہم خدا سے خائف ہوں گے۔ تب انسان کا خوف دور ہوگا۔

بے قبضہ ہونا

جب میں نے خود کو سیاسیات کے کنٹرول کے اندر کھنچا ہوا پایا۔ تب میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ بد اخلاقی۔ جھوٹ اور جسے سیاسی داؤ کہا کرتے ہیں۔ ان سب سے قطعی طور پر بے لاگ رہنے کے لئے میرے لئے کیا کچھ ضروری ہے۔ شروع شروع میں میرے لئے یہ بڑی مشکل جدوجہد تھی۔ اور اپنی بیوی اور مجھے ابھی تک یاد ہے اپنے بچوں کے ساتھ میری کشمکش تھی۔ مگر کچھ ہی ہو۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مجھے ان لوگوں کی خدمت کرنا مطلوب ہے۔ جن کے درمیان میں جیتا ہوں۔ اور جن کی مشکلات کو میں روز بروز دیکھ پاتا ہوں۔ مجھے کل دولت اور قبضہ کو خیرباد کہنا پڑے گا۔

میں سچائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تب میں نے فوراً ہر شے کو ترک کر دیا تھا۔ مجھے آپ کے روبرو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ابتدا میں ترقی بہت دھیمی تھی۔ اور آج جب میں جدوجہد کے دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایسا کرنا مجھے دردناک معلوم ہوتا تھا۔ مگر جوں جوں دن گذرتے گئے۔

مجھے وہ کئی چیزیں ترک کرنی پڑیں جنہیں میں اپنی خیال کرتا تھا۔ اور پھر ایسا وقت آگیا۔ کہ ان چیزوں کا ترک میرے لئے ایک باعث خوشی ہو گیا۔ اور یکے بعد دیگرے تقریباً سلسلہ ہندسیہ کے مطابق چیزیں مجھ سے چھوٹتی گئیں۔ اور چونکہ میں اپنا تجربہ بیان کر رہا ہوں میں کہتا ہوں۔ کہ میرے کندھوں سے بہت سا بوجھ اتر گیا اور میں نے دیکھا کہ اب میں آسانی کے ساتھ چلنے پھرنے اور بڑی راحت اور مزید تر مسرت کے ساتھ اپنے ابنائے جنس کی خدمت کا کام کرنے کے قابل ہو گیا۔ تب کسی چیز پر قبضہ ہی میرے لئے ایک دکھدائی شئے اور بوجھ بن گیا۔ میں نے اپنی خوشی کا سبب تلاش کرتے ہوئے دیکھا۔ کہ اگر میں کسی شئے کو اپنے قبضے میں رکھوں۔ تو اس کی حفاظت کے لئے مجھے ساری دنیا کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔ نیز میں نے دیکھا۔ کہ اکثر لوگ اس چیز سے محروم تھے۔ اگر اس کے لئے وہ حاجت مند تھے۔ اور مجھے پولیس کی مدد طلب کرنی پڑے گی۔ اگر قحط زدہ بھوکے لوگ مجھے تنہا پاکر اس چیز کو نہ صرف میرے ساتھ بانٹنا بلکہ مجھ سے چھیننا چاہتے ہوں۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ اگر وہ اس شئے کے خواہشمند ہو کر مجھ سے چھین لیتے ہیں۔ تو وہ کسی بدخواہانہ محرک سے نہیں بلکہ صرف اس لئے ایسا کرتے ہیں۔ کہ وہ میری نسبت اس شئے کی زیادہ حاجت رکھتے ہیں۔

ہماری تہذیب۔ ہماری ترقی اور ہمارا سوراج حاجات کو بڑھانے یعنی خود پسندگی کی بجائے ہماری حاجات کی محدودیت، خود انکاری پر انحصار رکھتے ہیں۔

جب تک کہ کام کرنے کے لائق جسم رکھنے والا ایک مرد یا ایک عورت بھی کام اور خوراک سے محروم ہے۔ میرے لئے آرام کرنا اور پیٹ بھر کر کھانا شرم کی بات ہے۔

مذہب کا اعلےٰ ترین کمال یہی تقاضا کرتا ہے۔ کہ ہم قبضے کو بالکل چھوڑ دیں۔ ہستی کا قانون معلوم کر چکنے پر ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی بساط کے مطابق اسے عمل میں

ڈالنے کے لئے کوشاں ہوں۔

سنہری قاعدہ یہی ہے کہ ہم مصمم ارادے کے ساتھ اس شے کو ترک کر دیں۔ جس سے لاکھوں لوگ محروم ہیں۔ ترک کی یہ قابلیت ہمارے اوپر یکدم نازل نہیں ہو جائے گی۔ سب سے پہلی بات تو ایسے ذہنی نظریہ کو نشو و نما دینا ہے۔ جو ان تعیشات اور حظوظ کو جو لکھو کھا انسانوں کو میسر نہیں ہیں۔ قبضہ میں رکھنا نہیں چاہتا ہو اس کے بعد فوراً ہی اپنی زندگیوں کو اس ذہنیت کے مطابق از سر نو مرتب کرنا ہوگا۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے۔ کہ کچھ بھی قبضے میں نہ رکھنے کا اصول خیالات اور اشیا دونوں پر ہی عائد ہوتا ہے۔ جو شخص بے سود علم سے اپنے دماغ کو بھر لیتا ہے۔ وہ اس انمول اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ خیالات جو ہمارے خدا سے پرے ہٹتے یا اس کی طرف رجوع نہ کرنے کا رخ رکھتے ہیں۔ ملکیت مواقعات ہیں۔ جن سے مخلصی پانا ضروری ہے۔ اس خصوص میں ہم گیتا کے تیرھویں ادھیائے میں بتلائی ہوئی علم کی تعریف پر غور کریں گے۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ تواضع امانتو) وغیرہ صفت ہی علم ہیں۔ باقی سب کچھ جہالت ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ بات سچ ہے۔ تو وہ بہت سی باتیں جنہیں ہم علم جان کر سیکھا کرتے ہیں۔ خالی جہالت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ ہمارے لئے مفید ثابت ہونے کی بجائے ہمیں نقصان پہنچایا کرتی ہیں۔ ایسا علم من کو بھٹکاتا ہوا اسے بالکل سونا بنا کر ہماری بے چینی کو اپنی بے انتہا شاخوں میں فروغ پذیر ہونے کا موقع دیتا ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہم سستی کی حمایت نہیں کر رہے۔ ضروری ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ایک لمحہ کام سے پر ہو۔ مگر وہ کام سادگی سچائی کی طرف میلان رکھنے والا ہونا چاہئے۔ جو شخص اپنی زندگی کو خدمت کے لئے وقف کر چکا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی بیکار نہیں رہ سکتا۔

لیکن انسان کو نیک عمل اور بُرے عمل میں امتیاز کرنا سیکھنا ہوگا۔ یہ امتیاز قدرتی طور پر خدمت کے لیے یک مقصد لگن کے ساتھ قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے۔ کچھ بھی قبضہ میں نہ رکھنے اور چوری نہ کرنے میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ ایک غیر مسروقہ شے کو بھی جو ہمیں درکار نہیں ہے۔ اپنے قبضہ میں رکھنا چوری، قبضہ میں مستقبل کے لئے فراہمی کا خیال موجود ہوتا ہے۔ سچائی کا طالب "قانون محبت" کا مقلد کل کے لئے کسی بھی شے کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ اس سے زیادہ پیدا ہی نہیں کرتا جس قدر کہ اسے روز بروز درکار ہوتا ہے۔ اگر ہم خدا کی پروردگاری میں اعتماد رکھنے کے قابل ہوں۔ تب ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ وہ ہمیں روحانی روٹی دیتا ہوا جو کچھ ہمیں درکار ہے کافی مقدار میں مہیا کریگا۔ ہم یا تو اس ایزدی قانون کو جانتے ہی نہیں یا اسے بھول رہے ہیں۔ جس کے مطابق خدا انسان کو روزانہ خوراک کے سوا اور کچھ نہیں دیتا۔ اور اس جہالت یا غفلت سے وہ عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ جو اس کے ساتھ متلازم مصیبت میں منتج ہوتی ہے۔ دولت مند لوگ اُن اشیاء کا بافراط ذخیرہ رکھتے ہیں۔ جو انہیں درکار نہیں ہیں۔ اور جو اس لئے بیکار پڑی رہتی ہیں یا ضائع ہو جاتی ہیں۔ جب کہ لکھو کھا انسان اُن سے محروم ہونے کے باعث بھوکے مرا کرتے ہیں یا سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں۔ اگر ہر ایک شخص اپنے پاس وہی کچھ رکھتا جو اسے مطلوب ہے۔ تب کوئی شخص بھی محتاج نہ ہوتا۔ اور سب کے سب بڑے اطمینان سے زندگی بسر کیا کرتے۔ مگر آج غریبوں کی مانند دولت مند بھی اشانت اور غیر مطمئن دیکھے جاتے ہیں۔ اب غریب انسان لکھ پتی ہونا چاہتا ہے۔ اور لکھ پتی انسان لاکھوں روپے جمع کرنا چاہتا ہے۔ غریب لوگ عام طور پر اس بات پر مطمئن نہیں رہ سکتے کہ انہیں بس پیٹ بھر کر کھانا مل جائے۔

مگر وہ صاف طور پر اس امر کا حق رکھتے ہیں۔ اور سوسائیٹی کا فرض ہے۔ کہ وہ انہیں اس قدر خوراک سے محروم نہ رہنے دے۔ دولت مند لوگوں کو اس بارہ میں اس مقصد سے ابتدا کرنی ہوگی۔ کہ ساری دنیا میں امن کی روح پھیل جائے۔ اگر وہ اپنی جائیداد کو معتدل حدود کے اندر ہی محدود رکھنے لگ جائیں۔ تب غریب لوگوں کو آسانی سے کھانا مل سکیگا۔ اور وہ امرا کے ساتھ ہی قناعت کا سبق سیکھ سکیں گے۔ کچھ بھی قبضے میں نہ رکھنے کے معیار کی کامل عمل پذیری تقاضا کرتی ہے۔ کہ انسان کو بھی پرندوں کی مانند اپنے سر والی پر کوئی چھت اور کل کے لئے کوئی کپڑا یا ذخیرہ خوراک نہیں رکھنا چاہیئے بیشک انسان کو روزانہ خوراک درکار ہوگی۔ مگر اُسے مہیا کرنا خدا کا کام ہوگا۔ انسان کا نہیں۔ مگر بہت سے معدودے ارواح ہی اس معیار پر کاربند ہو سکتی ہیں۔ ہم ایسے طالبانِ حقیقت اس معیار کو لگاتار اپنے سامنے رکھتے ہوئے اس کی روشنی میں اپنی جائداد کے نکتہ چین معائنہ کے ذریعے اسے روز بروز کم کر سکتے ہیں۔ تہذیب اپنے اصلی معنوں میں حاجات کو بڑھانے کی بجائے جان بوجھ کر اور اپنی مرضی سے انہیں گھٹاتا ہے۔ اسی سے حقیقی خوشی اور اطمینان کی ترقی ہونے سے خدمت کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ انسان استقلال کے ذریعے اپنی حاجات کو گھٹا سکتا ہے۔ اور حاجات کی تقلیل خوشی یعنی صحیح جسم اور پُر امن ذہن دیتی ہے۔ حقیقت کے نقطۂ نگاہ سے جسم بھی ایک طرح کا ملک ہے۔ جسے روح نے حاصل کیا ہے۔ ہم نے لطف اندوزی کی خواہش سے اسے پیدا کیا ہے۔ اور جسم کی صورت اس بار مزاحمہ کو جاری رکھتے ہیں۔ جب یہ خواہش دُور ہو جاتی ہے۔ تب جسم کے لئے کوئی خواہش نہ رہنے پر انسان جنم اور مرن کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے۔ روح ہر جا موجود ہے۔ بھلا وہ کیوں ایک پنجرے کی مانند جسم کے اندر

قید ہو وہ اسی پنجرے کی خاطر بدی اور قتل کو روا رکھے؟ اس طرح ہم قطعی ترک کے نصب العین پر پہنچ کر جسم کو جب تک یہ قائم ہے۔ خدمت میں استعمال کرنا سیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے لئے روٹی کی بجائے خدمت ہی زندگی ہو جاتی ہے۔ تب ہم صرف خدمت کی خاطر ہی کھاتے، پیتے، سوتے اور جاگا کرتے ہیں۔ یہی بات ہمیں خوشی اور وقت آنے پر سرور دیدار سے بہرہ ور کرتی ہے۔ ہم سب کو اسی نقطہ نگاہ سے اپنی جانچ پڑتال کرنی واجب ہے۔

دُنیا کا اختیار ہے کہ وہ میرے بے سرو سامان ہونے پر ہنسا کرے۔ مجھے سب کچھ چھوڑ دینے سے مثبت فائدہ ہوا ہے۔ میں اس بات کا خواہشمند ہوں۔ کہ لوگ امن و اطمینان کے لحاظ سے میرے ساتھ مقابلہ کریں۔ یہی میرا نہایت بیش قیمت خزانہ ہے اور شاید یہ کہنا درست ہے کہ میں غریب ہونے پر بھی ایک متمول انسان ہوں۔

اس واسطے سب کچھ چھوڑ کر ایشور کے ارپن کرتے ہوئے زندگی بسر کرو۔ اس طرح پر زندگی کا حق تیاگ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور پھر انسان یہ کہنے کی بجائے کہ "جب اور لوگ بھی اپنا فرض ادا کریں گے۔ تب میں بھی اپنا فرض ادا کروں گا" یہ کہتا ہے کہ "دوسروں کی چنتا چھوڑ کر پہلے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے باقی سب کچھ پرماتما پر چھوڑ دیا۔"

بے شک ایسے مواقع ہو سکتے ہیں۔ کہ مادی اشیا کو قبضہ میں لانا یا برتنا پڑے مگر زندگی کی راز اس میں سے ہے۔ کہ ہمیں آگے کھینچے جلنے یا نہ ہونے پر کبھی افسوس نہ ہو۔

دِرِدر نارائن

مسیح۔ محمد۔ بدھ۔ نانک۔ کبیر۔ چیتنیہ۔ شنکر۔ دیانند۔ رام کرشن ایسے لوگ ہو گذرے ہیں۔ جنہوں نے ہزارہا لوگوں پہ بے اندازہ اثر ڈال کر ان کی خصلت کو بدل ڈالا ہے۔ ان کی زندگیوں کی بدولت یہ دُنیا زیادہ متمول ہو گئی ہے۔ ان سب لوگوں نے ناداری کو ہی اپنا حصہ بنالیا تھا۔ جہاں تک ہم زمانہ حال کے مادہ پرستانہ خبط کو ہی اپنا مقصد قرار دے رکھا ہے۔ وہاں تک ہم ترقی کے پربت پہ اوپر چڑھنے کی بجائے اس سے نیچے اُتر رہے ہیں۔

گناہوں اور غلط کاریوں کا کتنا بڑا بھاری محصول ہے۔ جو دولت طاقت اور وقار انسان سے وصول کیا کرتے ہیں!

دِرِدر نارائن ان لاکھوں ناموں میں سے ایک ہے۔ جس کے ذریعے نوع انسان اُس پروردگار کو جانا کرتی ہے جسے بیان کرنے اور جس کی تھاہ پانے سے انسانی عقل عاجز ہے۔ اس کے معنی غریبوں کا خدا ہیں۔ یعنی وہ خدا جو غریبوں کے دلوں میں نمودار

ہوتا ہے۔

میں فاقہ کشی کے ذریعے خودکشی سے صرف اس لئے بچا چلا آتا ہوں۔ کہ مجھے پورا یقین ہے۔ کہ ہندوستان بیدار ہو کر خود۔ کو اس تباہ کن افلاس سے آزادی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔ اس امکان میں یقین کے بغیر میں زندگی میں دلچسپی نہیں رکھ سکتا۔

غریبوں کے لئے تو اقتصادیات ہی روحانیت ہے۔ بھوک سے مرتے ہوئے لکھو کھا انسان اور کوئی اپیل سُننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ اُن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ ہاں اگر تم انہیں خوراک دو۔ تو تمہیں وہ اپنا خدا ماننے لگیں گے۔ وہ اور کسی بات کا خیال کر ہی نہیں سکتے۔

میں نے اس اپنے ہاتھ سے ان لوگوں سے چیتھڑوں میں مضبوطی کے ساتھ بندھے ہوئے خاک آلود پیسے جمع کئے ہیں۔ ان کے روبرو زمانہ حال کی ترقی یا خدا کا ذکر کرنا محض بے سود ہے۔ اگر تم ان کے آگے خدا کا ذکر کرو گے۔ تو وہ تمہیں شیطان خیال کریں گے۔ اگر وہ کسی خدا کو جانتے ہیں۔ تو وہ صرف مہیب منتقم اور بے رحم اور ظالم خدا ہے۔

دھن اکٹھا کرنا پاپ اکٹھا کرنا ہے

دولت جمع کرنے کا ہنر ایک گرانے والا اور قابل حقارت ہنر ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہی ہم دولت کو مفید طور پر خرچ کرنے کا ہنر نہ جانتے ہوں۔

وہ خدا جو ننھی سی چیونٹی کے لئے خوراک کا ذرہ اور ہاتھی کے لئے ایک من کا بڑا گولا مہیا کرتا ہے۔ انسان کے لئے اس کی روزانہ خوراک مہیا کرنے سے غافل نہیں رہ سکتا۔ مخلوقاتِ فطرت کل کے لئے کوئی چنتا اور تشویش نہ رکھتی ہوئی کل

کو خود اک مہیا ہونے کی منتظر رہا کرتی ہے۔ صرف انسان ہی اپنے خود پسندانہ غرور اور خود پرستی میں خود کو زمین کا مالک جان کر اپنے لئے فانی اشیاء کا ذخیرہ جمع کرنے میں لگا رہتا ہے۔ فطرت ہر روز اسے سخت صدمے پہنچا کر اسے اس غرور سے نجات دینا چاہتی ہے۔ مگر وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ستیاگرہ وہ خاص دوا ہے۔ جو انسان کو تواضع کا سبق سکھلا سکتی ہے۔

دنیا کی عام تجویز یہ ہے۔ کہ سونا اور نیکی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ دُنیا میں یہ افسوسناک حالت دیکھی جاتی ہے۔ مگر یہ کوئی اٹل قانون نہیں ہے۔ ہم جنک کی مشہور مثال پاتے ہیں۔ جو دولت سے مالا مال ہونے اور بے حد طاقت رکھنے یا ایک راجا ہونے کے باوجود اپنے زمانے کا پاکیزہ ترین انسان تھا۔ اور زمانہ حال میں بھی میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے خوش قسمتی سے چند ایسے ذی ثروت لوگوں کو دیکھ پایا ہے۔ جو دولت مندی کی حالت میں بھی ایک سیدھی اور پاک زندگی بسر کرنے کو ناممکن نہیں پاتے۔

سدا اور ہر جگہ غریبوں میں بسنے والے خدا کی پرستش کیا کرو!

میں اپنی ساری زندگی میں غریبوں کے ساتھ بہت پیار کرتا رہا ہوں۔ میں اپنی گذشتہ زندگی میں سے اس امر کی بے شمار مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ کہ یہ میرے اندر فطری طور پر ہی موجود ہے۔ میں نے کبھی اپنے اور غریبوں کے درمیان کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کیا۔ میں ہمیشہ ہی انہیں اپنے قریبی رشتہ دار محسوس کرتا رہا ہوں۔

کھادی سیوا۔ گرام سیوا اور ہری جن سیوا درحقیقت ایک ہی شے کے تین نام ہیں۔ وہ سب کی سب ایسی انسانی خدمات ہیں۔ جو درِدر نارائن کی سیوا کے سوا اور کوئی غرض نہیں رکھتیں۔ لکھو کھا درِدر نارائنوں کے درمیان ہری جن سب

سے بڑھ کر چلے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کی خدمت میں لازمی طور پر سبھی کی خدمت شامل ہے۔ ایشور کے نام پر ہر جن کو پانی کا پیالہ دینا نوع انسان کے تمام پسماندہ افراد کے آگے ہی پانی کا پیالہ نذر کرنا ہے۔

(اہلِ برطانیہ سے) تمہارے ہاں تیس لاکھ آدمی بے کار ہیں۔ اور ہمارے ملک میں تیس کروڑ افراد آدھا سال بیکار رہتے ہیں۔ بیکاروں کے لئے آپ کی متوسط خیرات ستر شلنگ ہے۔ اور ہماری متوسط آمدنی فی ماہ سات شلنگ چھ پنس ہے۔ اس مزدور کا کہنا بالکل درست ہے۔ کہ وہ اپنی نظروں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں۔ کہ بیکاری اور دوسروں کی خیرات پر جینا انسان کے لئے ذلت آمیز بات ہے۔ میں کسی سٹرائیک کی رہنمائی کرتا ہوا سٹرائک کرنے والوں کی ایک دن کی بیکاری کو بھی برداشت نہ کرتا ہوا ان سے پتھر توڑنے، ریت ڈھونے اور عام گلیوں میں کام کرنے میں لگاؤں گا۔ اور اپنے ساتھیوں کو بھی ان کے ساتھ شامل کرنے کی ہدائت کروں گا۔ ذرا خیال کرو۔ کہ تیس کروڑ افراد کی بیماری کتنی بڑی مصیبت ہے! جن میں سے لاکھوں ہی بعد خودداری اور خدا پر بھروسہ نہ ہونے کے باعث ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے خدا کا پیغام پیش کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ ان فاقہ زدہ لاکھوں افراد کے روبرو جو اپنی آنکھوں میں کوئی چمک نہیں رکھتے اور جن کا واحد خدا روٹی ہی ہے۔ خدا کا پیغام پیش کرنا ایسا ہی بے معنی ہوگا۔ جیسا کہ اس پیغام کو ایک بھوکے کتے کے روبرو رکھنا۔ میں ان کے روبرو خدا کا پیغام صرف اسی حالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ جب کہ میں انہیں متبرک کام کا پیغام بھی دے سکوں۔ ہمارے لئے جب کہ ہم نفیس ناشتہ کھا کر بیٹھے ہیں۔ اور وہاں کے نفیس تر کھانے کے منتظر ہیں۔ خدا کے متعلق بات چیت بہت لطف آمیز ہو سکتی ہے۔ مگر میں ان لاکھوں افراد کے سامنے خدا

کے بارہ میں کیا بات چیت کر سکتا ہوں۔ جنہیں دن میں دوبارہ بھی کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ان کے لئے تو خدا صرف روٹی اور مکھن کی صورت میں ہی درشن دے سکتا ہے ہندوستان کے کاشتکار اپنی زمین سے روٹی حاصل کر رہے تھے۔ میں نے ان کے آگے چرخہ اس لئے پیش کیا ہے۔ کہ اس کے ذریعے وہ مکھن بھی حاصل کر سکیں۔ اور اگر میں آج اہل برطانیہ کے روبرو لنگوٹی باندھے ہوئے پیش ہوتا ہوں۔ تو صرف اس لئے کہ میں ان لاکھوں نیم فاقہ زدہ۔ نیم برہنہ لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہوں ہم نے دعا مانگی ہے۔ کہ ہم سب مل کر خدا کی دھوپ کو سینک سکیں۔ لیکن میں آپ سے کہہ دیتا ہوں۔ کہ یہ بات اس وقت تک ناممکن ہے۔ جبکہ لاکھوں لوگ آپ کے دروازوں کو کھٹکھٹا رہے ہوں۔ آپ لوگ اپنی مصیبت میں بھی نسبتاً خوش و خرم ہیں مجھے آپ کی خوشی کا ذرا دکھ نہیں ہے۔ میں آپ کی بھلائی چاہتا ہوں مگر آپ ہندوستان کے لاکھوں غریبوں کی قبروں کے سہارے فارغ البالی حاصل کرنے کا خیال چھوڑ دیں۔ میں ہندوستان کے لئے دوسری قوموں سے الگ زندگی نہیں چاہتا۔ مگر میں اپنی خوراک اور لباس کے لئے بھی کسی دوسرے ملک کا محتاج نہیں رہنا چاہتا۔ جب کہ ہم موجودہ مشکل کو عبور کرنے کے ذرائع تجویز کر سکتے ہیں۔ مگر میں آپ سے کہہ دیتا ہوں۔ کہ آپ لوگ لنکاشائر کی پرانی تجارت کی دوبارہ سرسبزی کی کوئی توقع نہ رکھیں۔ یہ ناممکن بات ہے۔ میرا مذہب مجھے اس کام میں آپ کی امداد کی اجازت نہیں دے سکتا۔

وشواس یا ایمان

ایسے موضوعات بھی ہیں۔ جن میں عقل ہمیں بہت دور تک نہیں لے جا سکتی اور ہمیں کئی باتوں کو اعتقاد کی بنا پر قبول کرنا پڑتا ہے ۔ اس حالت میں وشواس عقل کی تردید کرنے کی بجائے اس سے برتر ہوتا ہے ۔ وشواس ایک طرح کی چھٹی حِس ہے ۔ جو ان حالات میں کام کرتی ہے ۔ جو عقل کی حدِ نظر سے خارج ہیں ۔

اگر وشواس نہ ہو۔ تو یہ دُنیا ایک لمحہ میں ہی نابود ہو جائے۔ سچی عقیدت سے مراد ان لوگوں کے معقول تجربے کو اپنانا ہے ۔ جو تپسیا اور پرارتھنا کے ذریعے پاکیزہ زندگی بسر چکے ہیں ۔ اس لئے ان پیغامبروں اور اوتاروں کا عقیدت مند ہونا جو قدیم زمانوں میں گذر چکے ہیں ۔ بے معنی توہم ہونے کی بجائے ایک نہایت اندرونی ضرورت کو پورا کرتا ہے ۔

وشواس وہ نازک پھول نہیں ہے ۔ جو ذرا سے طوفانی موسم کے زیر اثر کملا

جائے گا۔ یہ ہمالہ کے پربتوں کی مانند ہے۔ جو شاید بدل ہی نہیں سکتے۔ کوئی طوفان بھی ہمالیہ کو اپنی بنیادوں سے متزلزل نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپ میں سے ہر ایک ایشور اور دھرم میں اپنے وشواس کو ترقی دے۔

یہ ہمارا وشواس ہی ہے۔ جو طوفانی سمندروں میں چلاتا ہے۔ پہاڑوں کو ہلاتا اور سمندر سے پار کود جاتا ہے۔ یہ وشواس سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ یہ اندرونی خدا کا زندہ اور باخبر شعور و احساس ہے۔ جسے یہ وشواس حاصل ہو چکا ہے۔ وہ کسی شئے کا محتاج نہیں رہ جاتا جسمانی طور پہ بیمار رہ کر بھی وہ روحانی طور پر صحیح و سالم جسمانی طور پہ غریب ہونے پہ بھی وہ روحانی دولت سے مالا مال ہوا کرتا ہے۔

اس عقیدے کو ایک خوش خیالی کا پرواز تصور کیا جا سکتا ہے۔ مگر میرا یہ پختہ یقین ہے کہ جو شخص خدا کا نام لیکر اس پر پورا بھروسہ رکھتا ہوا کسی کام کو شروع کرتا ہے۔ وہ عمر بھر ناکامیابی کا منہ نہیں دیکھ پاتا۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ میں نے جو کام ہاتھ میں لیا ہے۔ وہ میرا نہیں بلکہ خدا کا ہے۔

تمام مذاہب سچے ہیں

میرا اندرونی سیاست دان میرے کسی ایک فیصلے پہ غالب نہیں آ سکا۔ میں اگر سیاسیات میں حصہ لیتا ہوا معلوم ہوتا ہوں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ آج سیاسیات ہم سب کو سانپ کے کنڈل میں گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کنڈل سے خواہ کوئی کتنا ہی زور لگائے۔ باہر نکل نہیں سکتا۔ میں اس سانپ کے ساتھ زور آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ اور جو میں دانستہ طور پر ۱۸۹۴ء سے کر رہا ہوں۔ اور جیسا کہ اب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں دانستہ طور پر سن تمیز سے کرتا چلا آیا ہوں اگرچہ میری یہ خود غرضانہ خواہش ہے کہ اپنے چاروں طرف گرجتے اور شور و غل

مچاتے ہوئے طوفان کے درمیان امن کی زندگی بسر کر سکوں۔ میں مذہب کو سیاسیات میں داخل کر سکے اپنے اور اپنے دوستوں کے ساتھ تجربے کرتا چلا آیا ہوں۔ اور اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں۔ کہ مذہب سے میری مراد کیا ہے۔ اس سے مراد ہندو مذہب نہیں ہے۔ جسے میں دیگر تمام مذاہب پہ فائق سمجھتا ہوں۔ بلکہ وہ مذہب جو ہندو مذہب سے بھی برتر ہے۔ جو انسان کی فطرت کو ہی بدل ڈالتا ہے اور جو انسان کو اس کی اندرونی سچائی سے ناقابل جدائی طریق سے مربوط کرتا ہوا اسے سدا پاکیزگی دیتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا وہ پائیدار عنصر ہے۔ جو اپنے پورے اظہار کے لئے کسی قیمت کو بھی حد سے زیادہ خیال نہ کرتا ہوا روح کو اس وقت تک بالکل بے چین رکھتا ہے۔ جب تک کہ یہ خودشناسی سے بہرہ ور ہو کر اپنے خالق کو پہچانتی ہوئی اپنے اور خالق کے درمیان صحیح رشتے کو اچھی طرح سے نہ جان لے۔

میں ہندوستان اور نوع انسان کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ اور میں اس خدمت کی ادائیگی میں ہی مرنا پسند کرتا ہوں۔ میں اپنی تقلید کے لئے ایک مذہبی فرقہ بنا کر تسلی نہیں پا سکتا کیونکہ میں کوئی نئی سچائی پیش نہیں کرتا میں سچائی کی اُسی طرح ہی پیروی اور نمائندگی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسا کہ اسے جانتا ہوں۔ میں کئی قدیم سچائیوں پر نئی روشنی ڈالنے کا مدعی ہوں۔

بے شک ایک معنوں میں یہ بیان درست ہے۔ کہ میں اپنے مذہب کو اپنے ملک کی نسبت عزیز جانتا ہوں۔ اور اسی لئے میں پہلے ہندو ہوں۔ اور پھر قوم پرست ہوں۔ مگر میں اس وجہ سے دیگر بہتر قوم پرستوں کی نسبت کمتر قوم پرست نہیں ہوں۔ اس سے میری صرف یہ مراد ہے۔ کہ میرے ملک کے مفاد میرے مذہبی مفاد سے مختلف نہیں ہیں۔ اسی طرح جب میں کہتا ہوں

کہ میں اپنی نجات کو دوسری ہر ایک شے پر بلکہ ہندوستان کی نجات پر بھی ترجیح دیتا ہوں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ کہ میری شخصی نجات ہندوستان کی نجات یا کسی اور نجات کی قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔ بلکہ لازمی طور پر اس سے یہ مراد ہے کہ یہ دونوں ہی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

میرا مذہب قید خانے کا مذہب نہیں ہے۔ اس میں خدا کی ادنےٰ ترین مخلوق کے لئے بھی گنجائش ہے۔ مگر یہ کسی عنصر۔ نسل۔ مذہب یا رنگ کے تکبر سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

میں اس عقیدے کا قائل نہیں ہوں۔ کہ ساری زمین پر ایک مذہب ہو سکتا ہے یا ہو جائے گا۔ اس لئے میں مشترکہ عنصر دریافت کرنے اور باہمی رواداری کی ترغیب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں اپنے مقصد اور نوع انسان میں کافی سے زیادہ اعتقاد رکھتا ہوں انسانیت کے اعتبار سے ہندوستانی لوگ دیگر عوام سے کسی طرح پر بدتر ہونے کی بجائے شاید بہتر ہیں۔ در حقیقت ہر ایک اعلےٰ مقصد انسانی فطرت میں عقیدت رکھتا ہے۔ اگرچہ راستہ تاریک دکھائی دیتا ہے۔ خدا اس پر روشنی ڈال کر میری رہنمائی کرے گا۔ بشرطیکہ میرے اندر لاشعور میں وشواس اور اس کی ناقابل خطا رہنمائی کے بغیر مجھ میں اپنی بے بسی کے اعتراف کے لئے کافی انکسار پایا جاتا ہو۔

میرا عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کم و بیش سچے ہیں۔ کم و بیش اس لئے کہ میرا یقین ہے کہ انسانی ہاتھ جس شے کو چھوتا ہے۔ انسانی فطرت کے نامکمل ہونے کے باعث وہ شے بھی ناقص ہو جاتی ہے۔ مکمال خدا کی صفت خصوصی ہے۔ ہم اسے بیان یا اس کا ترجمہ نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں

کہ انسانی وجود کے لئے خدا کی مانند مکمل ہونا ممکن ہے۔ اور ہم سب کو لازم ہے۔ کہ حصول کمال کے آرزومند ہوں۔ مگر جب وہ مبارک حالت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی تعریف یادداشت کے ذریعے بیان نہیں کر سکتے۔ اور میں بڑے انکسار کے ساتھ معترف ہوں۔ کہ وید۔ قرآن۔ بائیبل بھی خدا کا نامکمل کلام ہیں اور ہم ناقص الوجود لوگوں کے لئے جو کثیر التعداد جذبات کے آگے پیچھے بھٹکا کرتے ہیں۔ اس خدائی کلام کو پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

مجھے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کے ساتھ جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں پیار کرنا چاہیئے۔ تاکہ ایک دوسرے کے تعلق میں سبھی لوگ بہتر ہو جائیں۔ اور اگر ہم ایسا کرنے لگیں۔ تو دنیا آج کی نسبت بہت بہتر اور جینے کے لائق مقام ہو جائے گی۔ میں وسیع ترین رواداری کا حامی ہوتا ہوا اسی غرض کے لئے کام کر رہا ہوں۔ میں لوگوں کو مشورہ دیا کرتا ہوں۔ کہ وہ ہر ایک مذہب کا اس مذہب کے مقلدین کے نقطۂ نگاہ سے خوب مطالعہ کریں۔ میں اُمید نہیں کرتا کہ میرے معیار کا ہندوستان صرف ایک ہی مذہب کو نشو و نما دینے والا ہوگا۔ یعنی بالکل ہی ہندو۔ بالکل ہی عیسائی یا بالکل ہی مسلمان ہوگا۔ مگر میں چاہتا ہوں۔ کہ یہ بالکل ہی روادار ہو۔ اور اس میں مذاہب مختلفہ پہلو بہ پہلو اپنا کام کیا کریں۔

دنیا میں کوئی ایسی شے موجود نہیں۔ جو مجھے عیسائیت یا کسی اور مذہب کو قبول کرنے سے روک سکے۔ جونہی کہ مجھے اس کی سچائی اور اس کی اپنے لئے ضرورت کا یقین ہو گیا ہو۔ جہاں بھی خوف پایا جائے۔ وہاں کوئی مذہب نہیں ہے۔ اگر بائیبل یا قرآن کی اپنی تعبیر کے ساتھ خود کو عیسائی یا مسلمان کہہ سکوں۔ تو مجھے ایسا کہنے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس حالت میں ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی

مرادف الفاظ ہو جائیں گے۔ میرا یقین ہے کہ اگلی دنیا میں نہ ہندو ہیں، اور نہ مسلمان۔ اور نہ عیسائی پائے جاتے ہیں۔ اور وہاں انہیں ان کے نشانات یا عقائد کی بجائے ان کے اعمال سے بلا لحاظ ان کے عقائد کے پرکھا جاتا ہے اس لئے میں آبا و اجداد کے لیبل کو برقرار رکھوں گا۔ بشرطیکہ وہ میری نشو و نما میں حائل ہو کر مجھے ہر جگہ سے اچھائی کے انجذاب میں مانع نہ ہوتا ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ میرے احباب مجھ سے یہ سُنکر کہ میں سناتنی ہوں پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ مجھ میں وہ چیزیں دیکھ نہیں پاتے۔ جنہیں وہ سناتنی ہندو کہلانے والوں سے منسوب کیا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کٹر سناتنی ہونے کے باوجود میں اپنے مذہب میں عیسائی۔ مسلمان اور زرتشتی تعلیمات کو جگہ دیتا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میرا ہندو مذہب بعض ایک کو مجمع معلوم ہوتا ہے۔ اور بعض تو اسے انتخابی مذہب کا نام دیا کرتے ہیں۔ کسی شخص کو انتخابی مذہب والا کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ کوئی مذہب نہیں رکھتا۔ مگر میرا مذہب تو اس قدر وسیع ہے۔ کہ وہ عیسائیوں کا مخالف نہیں۔ یہاں تک کہ یہ پلائی مت بھائی اور نہایت کٹر مسلمان کے برخلاف بھی نہیں ہے۔ یہ وسیع ترین رواداری پر مبنی ہے۔ میں کسی شخص کے خبطی اعمال کی وجہ سے اُسے برا بھلا کہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں انہیں اس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یہی وسیع مذہب مجھے سہارا دیتا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ حالت دوسروں کے لئے پریشان کن ہے۔ مگر میرے لئے ایسی نہیں ہے۔

میں اب تک پہاڑی وعظ اور بھگوت گیتا میں کوئی فرق نہیں دیکھ سکا جو بات کو وعظ ہو بہو بیان کرتا ہے۔ گیتا اسے علمی فارمولے کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ یہ اس لفظ کے مسلمہ معنوں میں سائنٹفک کتاب نہ ہو۔ مگر

اس نے قانون محبت کو جسے میں قانون تفویض کا نام دونگا۔ سائنٹیفک طور سے ثابت کیا ہے۔ پہاڑی وعظ اسی قانون کو حیرت انگیز زبان میں بیان کرتا ہے۔ عہد نامہ جدید کے مطالعہ نے مجھے بہت راحت اور بے انداز مسرت دی ہے کیونکہ یہ میرے روبرو اس کراہت کے بعد آیا ہے۔ جو میں نے عہد نامہ عتیق کے بعض اجزا کے مطالعہ میں محسوس کی تھی۔ آج اگر مجھ سے گیتا چھین لی جائے اور میں اس کے مضامین کو بالکل ہی بھول جاؤں اور اگر میرے پاس پہاڑی وعظ کا ایک نسخہ موجود ہو تو میں اس سے بھی وہی خوشی حاصل کروں گا۔ جو میں گیتا سے حاصل کرتا ہوں۔

ہندو مذہب اپنے پیغام اہنسا کے ساتھ میرے لئے دنیا میں اسی طرح ہی نہائت شاندار مذہب ہے جیسے کہ میری بیوی میرے لئے دنیا کی نہائت خوبصورت عورت ہے۔ لیکن دوسرے لوگ اپنے اپنے مذاہب کے متعلق ایسا ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کے ساتھ جو مجھے مل سکتا تھا۔ بحث و مباحثہ اور عبادت گذارانہ کھوج اور مطالعے کے بعد میں بہت عرصہ پیشتر اس نتیجہ پر فائز ہو گیا تھا۔ کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اور سب میں ہی کوئی نہ کوئی غلطی بھی پائی جاتی ہے۔ اور جب کہ میں اپنا مذہب رکھتا ہوں۔ مجھے ہندو مذہب کی مانند ہی دیگر مذاہب کے ساتھ پیار کرنا چاہیئے۔ اور اس سے منطقی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ہمیں سب کے ساتھ اپنے خویش و اقربا کی مانند ہی پیار کرنے چاہیئے ان کے درمیان کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھنا چاہیئے۔

مجھ میں ایک بات پائی جاتی ہے۔ کہ میں چیزوں کے معیوب پہلو کو دیکھنے کی بجائے اس کے روشن پہلو پر نظر رکھنے کا شائق ہوں۔ اور اسی لئے میں کسی

بھی عظیم مذہب کی کسی بھی مقدس کتاب سے راحت اور ابھار حاصل کر سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں گیتا کا کوئی شلوک یا عہد نامہ جدید کو زبانی نہ سُنا سکوں اور ایک ہندو یا عیسائی بچہ مجھ سے بہتر طریق پر شلوک سُنا سکے۔ مگر وہ ہوشیار بچے مجھے اس روح سے محروم نہیں کر سکتے۔ جو میں نے ان دونوں مقدس کتابوں سے جذب کی ہوئی ہے۔

خدا کی ہستی میں اعتقاد کل مذاہب کا بنیادی پتھر ہے۔ مگر میں مستقبل میں اس وقت کو دیکھ نہیں پاتا۔ جب کہ اس زمین پر عملی طور پر ایک ہی مذہب ہوگا۔ نظری طور پر چونکہ خدا ایک ہے۔ اس لئے ایک ہی مذہب ہو سکتا ہے مگر مجھے آج تک ایسے دو شخص بھی نہیں ملے۔ جو خدا کے متعلق بالکل ہی یکساں طرز کا تصور رکھتے ہوں۔ اس لئے مختلف مزاجوں اور آب و ہوا کی مختلف حالتوں کے مطابق دُنیا میں ہمیشہ ہی مختلف مذاہب پائے جائیں گے۔

میں دُنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے بنیادی اصول کا معتقد ہوں۔ میرا یقین ہے کہ وہ سب کے سب خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے ضروری تھے۔ جن پر ان کا انکشاف ہوا تھا۔ نیز میرا یقین ہے۔ کہ اگر ہم مذاہب مختلفہ کی کتب مقدسہ کا مطالعہ ان کے مقلدین کے نقطہ نگاہ سے کر سکیں۔ تب ہم دیکھ پائیں گے۔ کہ وہ سب کے سب اپنی تہ میں نہ صرف ایک ہی نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہیں۔

آج اقوام کی مانند مذاہب کو بھی ترازو میں تولا جا رہا ہے۔ وہ مذہب اور وہ قوم روئے زمین سے نابود ہو جائیں گے۔ جو بے انصافی۔ جھوٹ اور تشدد میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

مذہب سے میری مراد رسمی یا رواجی مذہب ہونے کی بجائے وہ مذہب ہے۔ جو تمام مذاہب کی تہ میں موجود رہتا ہوا ہمیں اپنے خالق کو روبرو دیکھنے کے قابل بناتا ہے۔

درحقیقت اتنے ہی مذاہب موجود ہیں جتنے کہ دنیا میں افراد پائے جاتے ہیں۔

مذاہب مختلف راستے ہیں۔ جو ایک نقطے پر جا کر باہم مل جاتے ہیں۔ اور جب کہ ہماری منزل مقصود ایک ہے۔ مختلف راستوں پر چلنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟

میرا گہرا یقین ہے کہ کوئی مذہب بھی حیوانی طاقت کے سہارے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے خلاف جو لوگ دوسروں کو مارنے کے لئے تلوار ہاتھ میں لیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی تلوار سے خود ہی مارے جاتے ہیں۔

عقلی جارحیت

میں عقل کے دبائے جانے کا حامی ہونے کی بجائے ہمارے اندر کی اس شے کے اعتراف کے حق میں ہوں۔ جو عقل کو بھی تقدس دیتی ہے۔

معقول پسند لوگ تعریف کے لائق ہیں۔ عقلیت اسی وقت انسانیت سوز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جبکہ یہ اپنے لئے قدرتِ مطلقہ کی مدعی بن بیٹھتی ہے۔ عقل کے ساتھ قدرتِ مطلقہ کا انتساب اسی طرح ہی بری قسم کی بت پرستی ہے۔ جس طرح کندے یا پتھر کو خدا مان کر اس کی پوجا کرنا ہے۔

میرا یقین ہے کہ میں اپنے اندر کوئی وہم نہیں رکھتا۔ سچائی صرف اس لئے سچائی نہیں کہلا سکتی۔ کہ وہ قدیم ہے اور نہ ہی یہ صرف اپنی قدامت

کے باعث مشتبہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی کئی ایسی بنیادی سچائیاں ہیں جنہیں ہم صرف اس وجہ سے بیک صری سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتے۔ کہ زندگی میں اُن پر عمل کرنا مشکل ہے۔

میری رائے میں وید غیر مری اور غیر مرقوم ہیں۔ صرف لفظی یا ظاہری معنی موت کے موجب ہوتے ہیں۔ یہ روح ہی ہے۔ جو روشنی دیتی ہے۔ اور ویدوں کی روح پاکیزگی۔ سچائی۔ معصومیت پاکدامنی۔ سادگی۔ عفو۔ خدا پرستی اور وہ ہر ایک شے ہے۔ جو انسان کو شریف اور دلیر بناتی ہے۔

مَیں نہیں مانتا۔ کہ صرف وید ہی خدا کی طرف سے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ وید، قرآن، ژند اوستا بھی ویدوں کی مانند الہامی ہیں۔ ہندو شاستروں میں میرا اعتقاد مجھ سے یہ تقاضا نہیں کرتا۔ کہ میں ان کے ہر لفظ اور ہر شلوک کو الہامی خیال کروں۔ مَیں کسی بھی تعبیر سے بندھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اگر وہ تعبیر میری عقل یا اخلاقی حس کو مکروہ محسوس ہوتی ہو۔

ہمارا آخری گرو ہمارا تجربہ ہی ہونا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھے ہوئے الفاظ بھی معاون ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی بھی تعبیر مطلوب ہوتی ہے اور جب مختلف تعبیرات میں تضاد پایا جائے۔ تب خود طالب ہی آخری ثالث ہوا کرتا ہے۔

میں لفظ پرست نہیں ہوں۔ اس لئے مَیں دُنیا کی مختلف کتب مقدسہ کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مَیں ان کتابوں کے بتلائے ہوئے معیار کو ہی جو کہ سچائی اور اہنسا ہے۔ کام میں لاتا ہوں۔ اور میں ان باتوں کو نظرانداز کرتا ہوا جو اس معیار کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس کے مطابق تمام باتوں کو اپنا لیا کرتا ہوں۔

تمام زمانوں کے لئے لا تغیر اخلاق مطلق کوئی وجود نہیں رکھتا۔ مگر ایسا اضافی اخلاق موجود ہے۔ جو ہماری مانند فانی ہستیوں کے لئے کافی مطلقیت رکھ سکتا ہے۔ مثلاً ہر ایک قسم کی شراب کو دوا کے طور پر ادویاتی مقدار کے مطابق اور طبی مشورے کے ماتحت برتنے کے علاوہ دیگر صورتوں میں اس کا استعمال بالکل ہی منافیٔ اخلاق ہے۔ اسی طرح ہی اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت کو شہوت پرستانہ نظر سے دیکھنا بالکل ناجائز ہے۔ یہ دونوں باتیں ٹھنڈی اور بے جوش و خروش عقل سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں مگر ان کے خلاف بھی دلائل پیش کی گئی ہیں۔ اور سدا پیش ہوتی رہی ہیں بلکہ خدا کے خلاف بھی جو کہ کل موجودات کی حاصل جمع ہے۔ دلائل دی جاتی ہیں وہ اعتقاد ہی جو عقل سے برتر ہے۔ ہمارا زمانوں کا اصل سہارا ہے۔ میرا اعتقاد مجھے بچاتا رہا ہے۔ اور اب بھی گڑھوں سے بچا رہا ہے۔ اس نے میرے ساتھ کبھی بے وفائی نہیں کی۔ اور کسی اور کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔

تجربے نے مجھے اس قدر متواضع بنا دیا ہے کہ میں عقل کی حدود مخصوصہ دیکھ سکوں۔ ٹھیک جس طرح بے محل مادہ گندگی ہو جاتا ہے اسی طرح عقل کا استعمال بھی اسے دیوانگی میں بدل ڈالتا ہے۔

باہمی رواداری اور قدر شناسی

اس پہلو میں مذہب تہذیب کے ساتھ ایک ہی بنیاد رکھتا ہے۔

ٹھیک جس طرح اپنی تہذیب کا تحفظ دوسری تہذیبات کی تحقیر کی بجائے ان کے بہترین نقاط کے انجذاب کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی طرح مذہب کا بھی یہی اصول ہونا چاہیئے۔ ہمارے موجودہ خوف اور خدشات اس زہریلے کرۂ ہوائی کے پھل ہیں۔

جو ملک میں باہمی منافرت۔ بدخواہی اور بے اعتمادی کی صورت میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ ہمیں سدا یہی ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص چپکے چپکے ہمارے یا ہمارے خویش و اقربا کے مذہب کو کھوکھلا کر ڈالے۔ مگر یہ غیر قدرتی حالت دور ہو جائے گی۔ جب ہم دوسرے مذاہب اور ان کے پیرو کاروں کے لئے احترام اور روا داری کو نشوونما دینے کا سبق سیکھ لیں گے۔

میں تبدیلی مذہب کے خلاف نہیں ہوں۔ مگر میں مذہب تبدیل کرنے کے موجودہ طریقوں کے خلاف ہوں۔ تبدیلی مذہب آج کل دیگر کاروباری امور کی مانند ایک کاروباری معاملہ ہو چلا ہے۔ میں نے ایک مشنری رپورٹ میں پڑھا ہے۔ کہ تبدیلی مذہب میں فی کس کس قدر خرچ آیا تھا۔ اور اس رپورٹ میں اگلی فصل کے لئے بھی بجٹ پیش کیا گیا ہے۔

میں ایک مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کے مروجہ معنوں میں تبدیلی مذہب کا قائل نہیں ہوں۔ مذہب تو انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک نہایت شخصی معاملہ ہے۔ میں اپنے پڑوسی کے مذہب کے خلاف جس کا میں اپنے مذہب کی مانند احترام کرتا ہے۔ کوئی مخالفانہ منصوبہ نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ میں تمام دیگر مذاہب عظیمہ کو بہر حال اُن کے مقلدین کے لئے ایسے ہی سچے خیال کرتا ہوں۔ جیسے کہ میرا مذہب میرے لئے ہے۔ دُنیا کی کتب مقدسہ کا احترام کے ساتھ مطالعہ کرنے پر میں ان سب میں ہی خوبیوں کے دیکھنے میں ذرا مشکل نہیں پاتا۔ میں ایک عیسائی، ایک مسلمان یا ایک پارسی یا ایک یہودی کو اپنا مذہب بدلنے کا مشورہ اسی طرح ہی نہیں دے سکتا۔ جس طرح کہ میں اپنے لئے تبدیل مذہب کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بات مجھے ان مذاہب کے پیرو کاروں کے نقائص سے اسی طرح بے خبر نہیں بناتی جس طرح کہ میں اپنے مذہب کے مقلدین کے سخت نقائص

کو بھول نہیں سکتا - اور یہ جانتا ہوا کہ مجھے اپنے عمل کو اپنے مذہب کے لیول پر بلند کرنے اور اپنے ہم مذہبوں میں اس کی تبلیغ کرنے کے لئے میرے تمام ذرائع نہ کافی ہوتے ہیں۔ میں دیگر مذاہب کے پیرو کاروں میں تبلیغ کی جرأت نہیں کرتا - دوسروں کی مت پوچھو تاکہ خود پر پوچھے نہ جاؤ ۔ میری نظر ایک صحیح ضابطہ عمل ہے - میرا یہ یقین دن بدن بڑھتا جا رہا ہے - کہ عیسائی مشنری ہندوستان کی حقیقی خدمت کر سکیں گے - بشرطیکہ وہ اپنے اعمال کو صرف انسانی خدمت محدود رکھتے ہوئے ہندوستان یا کم از کم اس کے بھولے بھالے دیہاتی لوگوں کو دائرہ عیسائیت میں لاکر ان کی اس مجلسی بالائی عمارت کو مسمار کرنے کا مقصد بعید نہ رکھتے ہوں - جو اپنے اندر کئی طرح کے نقائص رکھنے کے باوجود قدیم الایام سے اندرونی اور بیرونی حملوں کے مقابلے میں برابر قائم چلی آتی ہے - خواہ وہ مشنری اور ہم چاہیں یا نہ چاہیں - ہندو مذہب میں جو کچھ سچ ہے - وہ برقرار ہے - رہیگا اور جو کچھ جھوٹ ہے - وہ چکنا چور ہو جائے گا - ہر ایک مذہب کے اندر جو زندہ رہنا چاہتا ہے - دوبارہ شباب حاصل کرنے کی طاقت کا موجود ہونا ضروری ہے -

درخت مذہب ایک ہے - لیکن تمام مذاہب سچائی کی مختلف شاخیں ہیں

اس کی شاخوں میں جسمانی مساوات نہیں پائی جاتی - وہ سب کی سب نمو پذیر ہیں لیکن آخر کار بڑی سوچ بچار کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا - کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ صرف ایک ہی مذہب سچا ہے ، اور باقی سب مذاہب جھوٹے ہیں سالیا کوئی مذہب موجود نہیں - جو بالکل ہی مکمل ہو - سبھی یکساں طور پر نا مکمل یا کمتر مکمل ہیں - اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے - کہ عیسائیت بھی ایسی ہی سچی اور بھلی ہے - جیسا کہ کوئی اور مذہب ہے - اور یہی بات اسلام - زردشتی

اور یہودی مذاہب پر بھی صادق آتی ہے۔

مسلمانوں کا خدا نہ ہی ہے۔ جو عیسائیوں کا گاڈ اور ہندوؤں کا ایشور ہے جس طرح ہندو مذہب میں خدا کے لئے بے شمار نام پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اسلام میں بھی خدا کے بہت سے نام ہیں۔ نام انفرادیت کی بجائے صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور صغیر الوجود انسان نے اپنے عاجزانہ طریق سے قادر مطلق خدا کو صفات دے کر بیان کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ جملہ صفات سے بالاتر، ناقابل بیان اور غیر محدود ہے۔ اس خدا میں زندہ اعتقاد سے مراد انسانی اخوت کی قبولیت ہے۔ نیز اس کے معنی کل مذاہب کا احترام ہیں۔ اگر آپ کو اسلام پیارا ہے۔ تو مجھے ہندو مذہب پیارا ہے۔ اور عیسائیت عیسائیوں کو عزیز ہے۔ یہ یقین کرنا تشدد کی قسم کی رواداری ہوگا۔ کہ تمہارا مذہب دوسرے مذاہب سے فوقیت رکھتا ہے اور تمہیں یہ حق حاصل ہے۔ کہ تم دوسروں سے یہ تقاضا کیا کرو۔ کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر تمہارے مذہب کو قبول کر لیں۔

ہندو مذہب کوئی مخصوص یا فرقہ وارانہ

ہندو مذہب فرقہ وارانہ مذہب نہیں ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے۔ جو کچھ کہ اسلام، عیسائیت، بدھ مذہب اور مسلک زردشت میں بہترین ہے۔ میں دوسری ہر ایک شے کی مانند سیاسیات میں بھی روحانی جذبے کو لیکر داخل ہوتا ہوں۔ سچائی ہی میرا مذہب ہے اور حقیقت کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے اہنسا ہی میرا وسیلہ واحد ہے میں نے تلوار کے عقیدہ کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا ہے۔

میرے لئے ہندو مذہب ہر پہلو کافی ہے ہر ایک قسم کا عقیدہ اس کے وسیع حلقے میں تحفظ پاتا ہے۔

میں ہندو مذہب کے لئے اپنے جذبات کو صرف انہی جذبات سے ظاہر کر سکتا ہوں۔ جو کہ میں اپنی بیوی کے لئے رکھتا ہوں۔ وہ مجھ پر جس قدر اثر ڈال سکتی ہے۔ دنیا کی کوئی اور عورت ویسا اثر نہیں ڈال سکتی ہے۔ اسی کے یہ معنی نہیں ہے۔ کہ وہ بالکل ہی بے نقص ہے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ نقائص رکھتی ہے۔ مگر اس پر بھی میں اس کیلئے

ناقابلِ بیان تعلق کا جذبہ رکھتا ہوں۔ اسی طرح ہی ہندو مذہب کے کل نقائص اور عیوب کے باوجود میں اس کے ساتھ ویسا ہی تعلق محسوس کرتا ہوں۔

ہندو مذہب نے ہندوستانی تہذیب میں جو خاص اور بڑے سے بڑا اضافہ کیا ہے۔ وہ اہنسا ہے۔ اس نے ملک کی تاریخ کو گذشتہ تین ہزار سال سے ایک خاص رُخ دے رکھا ہے۔ اور آج بھی یہ لکھوکھا ہندوستانیوں کی زندگیوں میں ایک زندہ طاقت ہے۔ یہ ایک ترقی پذیر مسئلہ ہے اور آج بھی اس کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ اس کی تعلیم ہمارے لوگوں میں یہاں تک سرائیت کر چکی ہے کہ ہندوستان میں مسلح انقلاب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لئے نہیں۔ کہ جیسا کہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ہم جسمانی طور پر ایک کمزور نسل ہیں۔ کیونکہ کسی شخص کو شوٹ کرنے کی غرض سے جسمانی طاقت اس قدر درکار نہیں ہوا کرتی جس قدر کہ شیطانی ارادہ مطلوب ہوتا ہے۔ بلکہ اس لئے اہنسا نے لوگوں کے دلوں میں گہری جڑیں پکڑ لی ہیں۔

زردشت کی ہندو مذہب دیگر مذاہب کو خارج کرنے والا مذہب نہیں ہے۔ اس میں دُنیا بھر کے انبیا کی پرستش کے لئے گنجائش ہے۔ یہ معمولی معنوں میں تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے بہت سے قبیلوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ انجذاب ارتقائی قسم کا ہے اور اپنی صفتِ مخصوصہ کے لحاظ سے ناقابلِ بیان ہے۔ ہندو مذہب ہر ایک فردِ بشر کو یہی ہدایت کرتا ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب یا دھرم کے مطابق خدا کی پرستش کرتا ہوا دوسرے مذاہب کے ساتھ ہم آہنگی کی زندگی بسر کرے۔

ہندو دھرم کی سب سے بڑی اہمیت اس کے اس اعتقاد میں ہے۔ کہ کل زندگی (نہ صرف نوعِ انسان بلکہ تمام ذی حس مخلوقات ایک ہے۔ دوسرے لفظوں میں کل زندگی ایک ہی عالمگیر سرچشمہ سے نمودار ہو رہی ہے۔ اس سرچشمے کا نام اللہ گاڈ۔

پرمیشور۔ جو چاہو۔ رکھ سکتے ہو۔

بھگوت گیتا کی تعلیم

میں نہیں مانتا۔ کہ گیتا بھلائی کرنے کی خاطر تشدد کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ سب سے افضل طریق پر اس کشتی کو بیان کرتی ہے۔ جو ہمارے دلوں میں ہو رہی ہے۔ اس کے ابدی مصنف نے ایک تاریخی واقعہ کے ذریعے زندگی کے درخطر ہونے پر بھی اپنے فرض کی ادائیگی کا سبق سکھلانا چاہا ہے۔ یہ فرائض کو بلا لحاظ ان کے نتائج کے ادا کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ کیونکہ ہم فانی وجود رکھنے والے اپنے جسمانی قوالب سے محدود ہو کر اپنے اعمال کے سوا دیگر اعمال پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ گیتا روشنی اور اندھیرے کی طاقتوں میں تمیز کرتی ہوئی ان کا ناقابل تطابق ہونا ظاہر کرتی ہے۔

آج میرے لئے گیتا نہ صرف میری بائبل اور قرآن ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر میری ماں ہے۔ بہت عرصہ گذرا۔ کہ مجھے جنم دینے والی ماں انتقال کر گئی۔ لیکن یہ ابدی ماں مکمل طور پر میری ماں کی جگہ لیتی ہوئی سدا میرے پاس موجود رہتی ہے۔ یہ کبھی نہیں بدلتی اور اس نے ہر موقعہ پر میری امداد کی ہے۔ میں جب کبھی خود کو مشکل یا مصیبت میں پاتا ہوں۔ اسی ماں کے سینے میں ہی پناہ گزین ہوتا ہوں۔

میں جب کبھی خود کو مشکلات میں پاتا ہوں۔ اپنی ماں گیتا کی طرف دوڑتا ہوں۔ اور اب تک وہ مجھے امن و راحت دینے میں کبھی ناکامیاب نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ جو لوگ گیتا سے سکھ اور شانتی حاصل کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ امداد حاصل اور اس میں کوئی بالکل ہی جدید شے پا سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ اس طریق کو جان لیں۔ جس کے مطابق میں گیتا روز بروز سمجھا کرتا ہوں۔ اگر میرے اس طریق کو بتانا

لیں۔ جس کے مطابق میں گیتا کو روز بروز سمجھا کرتا ہوں۔ تو وہ اس سے مزید تر امداد اور کوئی بالکل ہی جدید تر روشنی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

اگرچہ میں عیسائیت کی بہت سی چیزوں کا مداح ہوں۔ مگر میں خود کو تقلید پرست عیسائیت کے ساتھ ایک میک نہیں کر سکتا۔ مگر میں خود کو تقلید پرست عیسائیوں کے ساتھ ایک میک نہیں کر سکتا۔ ..... ہندو مذہب جیسا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ پورے طور پر مجھے تسلی دیتا ہوا میرے وجود کو بھرپور کر دیتا ہے اور میں گیتا اور اُپنشدوں میں وہ تسکین اور شانتی پاتا ہوں۔ جو مجھے پہاڑی وعظ میں بھی نہیں ملتی۔ اس سے میری یہ مراد نہیں۔ کہ اس وعظ میں جو نصب العین پیش کیا گیا ہے۔ میں اس کا قدر داں نہیں ہوں۔ اور نہ ہی یہ مراد ہے کہ پہاڑی وعظ کی بعض تعلیمات نے مجھ پر کوئی پائیدار اثر نہیں ڈالا۔ مگر مجھے معترف ہونا پڑتا ہے ..... کہ جب کبھی میرے دل میں کوئی شک پیدا ہوتا ہے۔ یا مایوسیاں میرے روبرو آ کر گھورنے لگتی ہیں۔ اور جب میں اُفق پر روشنی کی ایک شعاع بھی نہیں دیکھ پاتا۔ تب میں گیتا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس میں کوئی ایسا شلوک پاتا ہوں۔ جو مجھے راحت دیتا ہے۔ اور میں بے پناہ غم کی حالت میں بھی مسکرانے لگتا ہوں۔ میری زندگی بیرونی آلام سے پُر ہے۔ اور اگر یہ الم ناک سوانحات مجھ پر کوئی مرئی یا امٹ اثر نہیں ڈال سکے۔ تو اس کا سبب گیتا کی تعلیمات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

حضرت مسیح میری نظر میں

عیسائیت کا ایک بالواسطہ اثر یہ ہوا ہے۔ کہ اس نے ہندو مذہب میں زندگی پیدا کر دی ہے۔ مگر ہندوستان میں عیسائیت کے اثر کا اندازہ اُس زندگی اور اس کے اثر سے لگانا چاہیے۔ جو کہ ایک متوسط عیسائی ہمارے

درمیان بسر کرتا ہے۔ مگر یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے۔ کہ اس کا اثر تباہ کن ہوا ہے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تاریخی مسیح میں کبھی دلچسپی محسوس نہیں کی۔ مجھ پر اس بات کا قطعاً اثر نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص آج یہ ثابت کر دے کہ مسیح کبھی ہوا ہی نہیں۔ اور جو کچھ انجیل میں بیان ہوا ہے۔ وہ مصنف کے تخیل کی تخلیق کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس حالت میں بھی میرے لئے پہاڑی وعظ کی سچائی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

میں حضرت مسیح کے ساتھ کسی مخصوص ایزدیت (خدائی صفت) کو منسوب نہیں کر سکتا۔ وہ رام یا کرشن۔ محمد یا زردشت کی مانند ہی ایزدیت رکھتا ہے میں بائیبل کے ہر ایک لفظ کو اسی طرح سے ہی خدا کا الہامی لفظ نہیں مانتا۔ جس طرح کہ میں وید یا قرآن کے ہر لفظ کو بھی خدا کا الہامی نہیں خیال کرتا۔ بے شک ان کتابوں میں ہر ایک مجموعی طور پر ملہم ہے۔ لیکن اگر میں اجزا کو الگ الگ دیکھوں۔ تو میں کئی مواقع پر اس الہام کو موجود نہیں پاتا۔ میری نظر میں بائیبل بھی گیتا اور قرآن کی مانند ہی ایک مذہبی کتاب ہے۔

اگرچہ میں فرقہ وارانہ معنوں میں عیسائی ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ مگر مسیح کے معصوم وجس اور عدم تشدد میں میری اس غیر فانی عقیدت کا ایک جزو ہے۔ جو میرے تمام دنیوی اور زمانی اعمال پر حکمران ہے۔

میرے لئے "مولود" کا لفظ روحانی پیدائش ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں میری تعبیر یہ ہے۔ کہ مسیح کی اپنی زندگی ہی اس کے تقرب ایزدی کی کلید ہے اور اس نے خدا کی روح اور ارادے کو بے مثال طریق سے ظاہر کیا ہے۔ انہی معنوں میں میں اسے خدا کے فرزند کے طور پر دیکھتا اور جانتا ہوں۔

یہ میری پختہ رائے ہے۔ کہ موجودہ یورپ خدا کی روح یا عیسائیت کی بجائے شیطان کی نمائندگی کرتا ہے۔ شیطان اس وقت بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ لبوں پر خدا کا نام لے کر نمودار ہوتا ہے۔ موجودہ یورپ صرف برائے نام عیسائی ہے۔ در حقیقت یہ زر و دولت کا پوجاری ہے۔ " اونٹ کے لئے سوئی کے ناکے میں سے گذرنا بہشت میں دولتمند کے داخل ہونے کی بہ نسبت سہل تر ہے "

در اصل مسیح کی یہی تعلیم تھی۔ مگر اس کے نام نہاد پیرو کار مادی مقبوضات سے اپنی اخلاقی ترقی کو ماپا کرتے ہیں۔

میرے لئے مسیح کیا معنی رکھتا ہے؟ میرے خیال میں وہ نوع انسان کے ان بڑے سے بڑے معلمین میں سے ہے۔ جو کبھی نمودار ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مقلدین کی نظر میں خدا کا تنہا فرزند مولود تھا۔ کیا اس بات کو ماننا یا نہ ماننا مجھ پر مسیح کے اثر کو گھٹا بڑھا سکتا ہے؟ کیا اس کی تعلیم اور اس کے عقیدے کی کل شان و عظمت میرے لئے ممنوع ہے؟ میں یہ باور نہیں کر سکتا۔

میرا یقین ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب کی خوبیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ نیز میں یقین کرتا ہوں۔ کہ ایسا کرنے کی کوشش غیر ضروری بلکہ ضرر رساں ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان میں سے ہر ایک عام قوتِ محرکہ رکھتا ہے اور وہ انسانی زندگی کو اوپر اٹھانے اور بامعنی و مقصد بنانے کی آرزو ہے۔ اور چونکہ مسیح کی زندگی وہ معنی اور برتری رکھتی ہے۔ جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اس لئے میرا یقین ہے کہ وہ صرف عیسائیت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ وہ تمام دنیا۔ تمام نسلوں اور لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس بات سے کوئی

فرق واقع نہیں ہوتا۔ کہ کس علم۔ نام اور عقیدے کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ کس مذہب کے معتقد ہیں۔ یا اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پائے ہوئے کس خدا کی پرستش کرتے ہیں۔

بدھ کا راستہ

یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے۔ کہ تعلیمات بدھ کا ضروری حصہ اب ہندو مذہب کا جزوِ سالم ہو گیا ہے۔ اب ہندو بھارت ورش کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اب پیچھے کی طرف لوٹ کر اس عظیم اصلاح کے پیچھے جا سکے۔ جو گوتم نے ہندو مذہب میں کی ہے۔ اس نے اپنے بے انداز ایثار۔ عظیم ترک اور اپنی زندگی کی بے لوث پاکیزگی سے ہندو مذہب پر اَمٹ اثر ڈالا ہے۔ اور ہندو مذہب اس عظیم معلم کا ابداً ممنونِ منت ہے۔ اور اگر ہندو مذہب نے بدھ مذہب کے اس جزو کو جسے آجکل بدھ مذہب سمجھا جاتا ہے۔ جذب نہیں کیا۔ تو وہ بدھ کی زندگی اور تعلیم کا ضروری جزو نہیں ہے۔

میں نے بے شمار دفعہ لوگوں کو دعوے کرتے سنا ہے۔ اور بدھ کی اصلی روح کو بیان کرنے کا دعوے کرنے والی کتابوں میں بھی پڑھا ہے۔ کہ بدھ خدا کی ہستی میں یقین نہ رکھتا تھا۔ میری عاجزانہ رائے میں ایسا عقیدہ تعلیم بدھ کی مرکزی سچائی کی تائید کرتا ہے۔ ...... گڑبڑ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ بدھ نے جائز طور پر ان تمام ادنے چیزوں سے انکار کر دیا تھا۔ جو اس کے عہد میں خدا کے نام کے تحت میں ہی شمار ہوتی تھیں۔ ذاتی طور پر اس نے اس خیال کی تردید کی تھی۔ کہ وہ ہستی جو خدا کہلاتی ہے۔ بدلی سے متحرک ہو کر اپنے اعمال کے لئے پچھتاوا اور دنیا کے بادشاہوں کی مانند ترغیبات اور رشوتوں سے متاثر ہو کر خاص خاص افراد کی طرف داری کر سکتی ہے۔

اس کی سادی روح نے نہائیت تندہی کے ساتھ اس عقیدہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ کہ وہ ہستی جسے خدا کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ اُن حیوانات کے زندہ خون سے جو اس کی اپنی مخلوق ہیں۔ خوش کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اس نے خدا کو ازسرِ نو اس کا صحیح مقام دے کر اس غاصب کو سفید تخت سے اُتار دیا ہے۔ جو اس وقت اس پر بیٹھ رہا تھا۔ اور اس نے اس کائنات کی اخلاقی حکومت کی ابدی اور ناقابلِ تغیر ہستی پر زور دیتے ہوئے اس کا ازسرِ نو اعلان کیا ہے۔ اور اس نے اس حقیقت کا اظہار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ کہ قانون خود ہی خدا ہے۔

نوعِ انسان کے لئے بدھ کا ایک بڑا دان خدا کو ازسرِ نو اس کے اصلی تخت پر بٹھانا ہے۔ مگر میری عاجزانہ رائے میں انسانیت کے لئے اس کا اور بھی عظیم تر دان کل زندگی کے لئے خواہ وہ کتنی ہی ادنیٰ قسم کی ہو کڑا لحاظ و احترام ہے۔

خدا کے قوانین ابدی اور ناقابلِ تغیر ہیں اور خدا سے جُدا نہیں کئے جا سکتے اور ایسا ہونا اس کی کمال کی لازمی شرط ہے۔ مگر اسی بات سے یہ گڑبڑ پیدا ہوئی ہے۔ کہ بدھ خدا کو نہ مانتا تھا۔ صرف اخلاقی قانون کا قائل تھا۔ اور خدا کے متعلق اس گڑبڑ کے باعث اہم لفظ نروان کو ٹھیک طور پر سمجھنے میں بھی گڑبڑ مچ گئی۔ یقینی طور پر نروان کے معنی قطعی فنا نہیں ہیں۔ جہاں تک میں بدھ کی زندگی کی مرکزی سچائی کو سمجھ سکا ہوں۔ یہ ان تمام ادنیٰ۔ بُری۔ فاسد اور فساد پذیر چیزوں کا قطعی خاتمہ ہے۔ جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ نروان قبر کے تاریک اور مردہ امن کی مانند ہونے کی بجائے زندہ امن اور روح کی زندہ خوشی ہے۔ جس میں وہ خود آگاہ ہونے کے علاوہ حقیقتِ ابدی کے دل میں اپنا مسکن حاصل

کر چکنے کی آگاہی رکھتی ہے۔

یہ میری بھی ہمیشہ رائے رہی ہے کہ بدھ مذہب۔ بلکہ تعلیم بدھ ہندوستان میں پوری طرح بار آور ثابت ہوئی ہے۔ اور اس کے خلاف ہونا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ خود گوتم ہندوؤں کا ہندو تھا۔ وہ ہندو مذہب کے بہترین عناصر سے لبریز تھا۔ اور اس نے ان بعض تعلیمات میں جان ڈال دی ہے۔ جو کہ ویدوں میں دب چکی تھیں۔ ان پر بہت سی فضول گھاس پھوس اُگ چکی تھی۔ اس کی عظیم ہندو روح نے بے معنی الفاظ کے اس جنگل میں سے راستہ کاٹا ہے۔ جس نے ویدوں کی عنبری سچائی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے ویدوں کے بعض الفاظ کو وہ معنی دیئے ہیں۔ جن سے اس زمانہ کے لوگ محض نابلد تھے۔ اور اس نے ہندوستان میں نہایت ہی موافق زمین پائی تھی۔ اور بدھ جہاں کہیں گیا۔ اس کے مقلد اور اسے چاروں طرف سے گھیرنے والے لوگ بھی غیر ہندوؤں کی بجائے وہ لوگ ہندو ہی تھے۔ جو خود بھی ویدک قانون میں دسترس رکھتے تھے۔ لیکن بدھ کی تعلیم بھی بدھ کی مانند ہر طرف وسعت پذیر اور سب کو عالمگیر کرنے والی تھی۔ اور اس لئے ہی یہ اس کے جسم کے بعد بھی برقرار رہ کر روئے زمین پر پھیل گئی۔ بدھ کا مقلد کہلانے کا خطرہ ہونے کے باوجود میں اس کامیابی کو ہندو مذہب کی فتح خیال کرتا ہوں۔ بدھ نے ہندو مذہب کو کبھی ترک کرنے کی بجائے اس کی بنیاد کو وسعت دے کر اسے نئی زندگی اور نئی تعبیر سے بہرہ ور کیا ہے۔ میں آپ کے روبرو یہ بھی اپنا چاہتا ہوں کہ تعلیم بدھ کو سیلون یا برما یا چین یا جاپان میں پورے طور پر جذب کیا ہی نہیں گیا۔

اسلام۔ میں اسلام کو بھی انہی معنوں میں امن پسند مذہب خیال کرتا

ہوں۔ جن معنوں میں کہ عیسائیت۔ ہندو اور بدھ مذاہب امن پسند متصور ہوتے ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں۔ کہ درجوں کا فرق موجود ہے۔ مگر ان مذاہب کا مقصد ایک ہی ہے۔

اسلام نے ہندوستان کی قومی ترقی میں جو اضافہ کیا ہے۔ وہ خدا کی توحید میں بے آمیزش عقیدہ اور ان لوگوں کے لئے جو برائے نام اس کے حلقے کے اندر ہیں۔ انسانی اخوت کا عملی استعمال ہے۔ میں ان ہر دو امور کو امتیازی اضافات اس لئے کہتا ہوں۔ کہ ہندو مذہب میں روحِ اخوت نے فلسفیانہ صورت اختیار کرلی ہے۔ اور اسی طرح اگرچہ فلسفیانہ ہندو مذہب اسلام کی مانند غیر مصالحت آمیز نہیں ہے۔

میں اپنی یہ رائے ظاہر کرچکا ہوں۔ کہ مقلدین اسلام تلوار کا حد سے زیادہ کھلا استعمال کرنے والے ہیں۔ مگر یہ بات تعلیم قرآن کا نتیجہ نہیں ہے۔ میری رائے میں اس کی وجہ وہ ماحول ہے۔ جس میں اسلام کا جنم ہوا تھا۔ عیسائیت اپنے خلاف خون آلودہ تاریخی شہادت رکھتی ہے۔ اور وہ اس لئے نہیں کہ مسیح کی تعلیم ناقص ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ جس ماحول میں اس کی اشاعت ہوئی۔ وہ اس کی بلند تعلیم سے متاثر ہو کر قابلیت نہ رکھتا تھا۔

قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی۔ جو دوسروں کا مذہب بدلنے کے لئے تشدد کی اجازت دیتی ہو۔ یہ مقدس کتاب صاف ترین الفاظ میں کہتی ہے "مذہب میں کوئی جبر نہیں ہے"۔ نبی کی ساری زندگی مذہبی امور میں جبر کی تردید کرتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ آج تک کسی مسلمان نے بھی جبر کی حمایت نہیں کی۔ اسلام مذہب عالم نہ رہے گا۔ اگر یہ اپنی اشاعت کے لئے طاقت کا سہارا لے گا ٭

شیطانی تہذیب

کیا انتقال مکانی کے لئے تیز رفتار آلات کے باعث دُنیا کچھ بہتر ہو چلی ہے؟ بھلا یہ آلات کس طرح انسانی ترقی میں اضافہ کر سکتے ہیں؟ کیا یہ انجام کار اس ترقی میں مانع نہیں ہوتے؟ اور کیا انسانی ہوس کی کوئی حد بھی ہے؟ کبھی تو ہم فی گھنٹہ چند میل پیدل چل سکنے پر ہی مطمئن تھے۔ لیکن اب ہم ایک گھنٹے میں سینکڑوں میل طے کرنا چاہتے ہیں۔ ایک روز ہم فضا میں بھی اڑنے کے خواہشمند ہونگے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ ابتری۔

موجودہ دستکارانہ تہذیب ایک بیماری ہے۔ کیونکہ یہ بدی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں نظر گیر الفاظ اور فقروں کے دھوکے سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ میں دخانی جہازوں اور تار برقی کے ساتھ کوئی پرخاش نہیں رکھتا۔ اگر یہ صنعتی نظام کے بغیر رہ سکتے ہوں۔ تو بے شک رہیں۔ وہ کوئی مقصد نہیں ہیں۔ مگر ہمیں دخانی جہازوں اور تار برقی کی خاطر لغو گیری کو برداشت نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ انسان کی پائیدار

بہبودی کے لئے کسی طرح سے بھی ضروری نہیں ہیں۔ اب جب کہ ہم قوت برقی اور خلائی جہاز کا استعمال کرنا جانتے ہیں ہمیں انہیں مناسب مواقع پر اور صنعتی نظام کو ترک کر چکنے کے بعد استعمال کرنا چاہیئے۔ ہمارا مقصد بہرحال صنعتی نظام کی تباہی ہے۔

میں فاصلے اور وقت کو مٹانے۔ حیوانی خواہشات کو بڑھانے اور ان کی تسلی کے لئے ساری زمین پر گھومنے کو میں دل و جان سے ناپسند کرتا ہوں۔ اگر موجودہ تہذیب کے یہی معنی ہوں۔ جیسا کہ میرے خیال میں ہیں۔ تو میں اسے شیطانی تہذیب کہونگا۔

وہ وقت آرہا ہے۔ جبکہ وہ لوگ اپنی خواہشات کو دیوانہ وار بڑھانے میں مصروف رہ کر یہ گمان کرتے ہیں کہ اس سے ان کی حقیقی قابلیت اور دُنیا کے حقیقی علم میں زیادتی ہوگی۔ پیچھے کی طرف لوٹ کر سوچنے لگیں گے کہ "ہم نے کیا کیا ہے؟ کئی تہذیبات کا ظہور اور خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور اس تمام ترقی کے باوجود جس پر ہمیں اس قدر ناز ہے۔ ہمیں بار بار یہ سوال کرنے کی طرف راغب ہوتا ہوں۔ "کس مقصد کے لیئے؟" ڈاروِن کے ہمعصر ویلیس نے بھی یہی بات کہی ہے کہ پچاس سالہ شاندار ایجادوں اور دریافتوں کے ذریعے انسان کی اخلاقی بلندی میں ایک انچ کا اضافہ بھی نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ہی ٹالسٹائی نے بھی جسے آپ خواب بین اور غیر عملی کہہ سکتے ہیں۔ کہا ہے مسیح بدھ اور محمد نے بھی جس کے مذہب سے میرے اپنے دیش میں انکار اور اس کا ابطال کیا جا رہا ہے۔ کہا ہے۔

میرا یقین ہے کہ اس خونریزی۔ حیلہ بازی اور ریاکاری کے باوجود جو مغربی دُنیا میں نہائیت عظیم پیمانے پر دیکھی جاتی ہے۔ ساری نوع انسان ہی چپ چاپ

مگر یقینی طور پر ایک بہتر زمانے کی طرف جا رہی ہے۔

میں ریلوں اور شفاخانوں کو تباہ کرنے کا مقصد نہیں رکھتا۔ اگرچہ میں یقینی طور پر ان کی تباہی کو خوش آمدید کہوں گا۔ نہ تو ریل اور نہ ہی شفاخانے اعلےٰ اور پاک تہذیب کے معیار ہو سکتے ہیں۔ ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ضروری بدی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی قوم کی اخلاقی قامت کو ایک انچ بھی نہیں بڑھا سکتا۔ اور نہ ہی میں قانونی عدالتوں کو مستقل طور پر تباہ کرنے کا مقصد رکھتا ہوں۔ اگرچہ ان کی تباہی وہ کمال ہوگا جس کا ہمیں صدق دلی سے خواہشمند ہونا چاہیئے۔ جس کا ہمیں عبادت گذارانہ طور پر خواہشمند ہونا چاہیئے۔ اور اس سے بھی کمتر میں مشینوں اور ملوں کو تباہ کرنے کی کوشش میں ہوں۔ کیونکہ اس غرض کے لئے اعلےٰ تر سادگی اور ترک درکار ہے۔ جس کے لئے موجودہ لوگ تیار ہی نہیں ہیں۔

ان چشموں سے جو تمہیں پہاڑی وعظ میں ملتے ہیں۔ ہر طرح سے دل کھول کر پیا کرو۔ لیکن تب تمہیں بوریا پہن کر بھبوت رمانی پڑے گی۔ پہاڑی وعظ کی تعلیم ہم میں سے ہر ایک کے لئے ہے۔ تم خدا اور شیطان دونوں کے خادم نہیں ہو سکتے۔ خدا نے جو رحیم۔ مہربان اور مجسم علم و بردباری ہے شیطان کو بھی تو دلں کے لئے اپنا کھیل دکھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس خود بخود مٹ جانے والے اور تباہ کن کھیل سے دور بھاگا کرو۔

میں نشوونما۔ خود اختیاری۔ آزادی کا زبردست حامی ہوں۔ مگر ان تمام چیزوں کو روح کی خاطر چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات میں کہ عہد فولاد۔ عہد چقماق سے بہتر ہے۔ شک ہے۔ میں ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہمیں اپنی عقل اور دیگر قوےٰ کو روحانی نشوونما میں لگانا چاہیئے۔

پچھلے زمانے میں جب لوگ آپس میں لڑا کرتے تھے۔ تب جسمانی طاقت سے خون کو پایا کرتے تھے۔ اب ایک شخص بھی پہاڑی پر بیٹھ کر اور اپنے ہاتھ میں بندوق لئے ہزاروں زندگیوں کو تلف کر سکتا ہے۔ یہ تہذیب ہے پہلے لوگ کھلی ہوا میں جس قدر چاہتے تھے کام کرتے تھے۔ اب ہزاروں لوگ اکٹھے ہو کر اپنے گذارے کے لئے فیکٹریوں اور کانوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کی حالت حیوانات سے بدتر ہے۔ انہیں لکھ پتی لوگوں کی خاطر نہایت خطرناک کاموں میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی ہے۔ ...... یہ تہذیب ایسی ہے۔ کہ صرف صابر رہنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ خود بخود ہی مٹ جائے گی ۔۔

اِنسان اُور مشین

سب سے بڑھ کر قابل لحاظ انسان ہے۔ مشین کو انسانی اعضاء کو دُبلا اور لاغر بنانے کا میلان نہیں رکھنا چاہیئے۔

اگر مشینری نابود ہو جائے۔ تو مَیں اسے نہ تو مصیبت سمجھونگا اور نہ اس پر گریہ وزاری کرونگا۔ مگر مَیں مشینوں کو تباہ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں رکھتا۔ اِنسانی فطرت پر وشواس رکھنا اچھی بات ہے۔ مَیں اس وشواس کی بدولت ہی جیتا ہوں۔ مگر یہ وشواس ہمیں اس تاریخی سچائی سے اندھا نہیں کرسکتا۔ کہ جب کہ انجام کار سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو کر رہے گا۔ افراد اور افراد کے مجموعے جنہیں اقوام کہا جاتا ہے۔ آج سے پہلے تلف ہو چکے ہیں۔ روم۔ یونان۔ بابل مصر اور بہت سے دوسرے ملک اس امر کی مسلمہ شہادت پیش کرتے ہیں۔ کہ آج سے پہلے قومیں اپنی بداعمالیوں کے باعث تلف ہو چکی ہیں۔ اب جس بات کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یورپ اپنی نفیس اور سٹینڈرڈ

عقل کے ذریعے اس بدیہی حقیقت کو جان کر پیچھے کی طرف ہٹتا ہوا مخرب اخلاق صنعتی نظام سے مخلصی پانے کا راستہ نکالے گا۔ اس غرض کے لئے قدیم طرز کی قطعی سادگی کی طرف رجوع کی ضرورت نہ ہوگی۔ مگر اسے ایک از سر نو تنظیم کرنی ہوگی۔ جس میں دیہاتی زندگی سب سے بڑھ کر اہمیت رکھیگی۔ اور جس میں حیوانی اور مادی طاقت کو روحانی طاقت کے ماتحت رکھا جائے گا۔

مشینری اپنی جگہ رکھتی ہے۔ اور اب یہ جاگزیں ہو چکی ہے۔ مگر اسے انسانی محنت کی جگہ لینے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ میں گھریلو مشین میں ہر ایک اصلاح کو خوش آمدید کہوں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ کہ مشینی طاقت سے چلنے والی چرخیوں کو انسان کی دستی محنت کی جگہ دینا جرم ہے۔ جب تک کہ ہم اس کے ساتھ ہی لاکھوں کسانوں کے لئے ان کے گھروں کام مہیا کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔

مشینری کی وہ تہذیب جو معدودے ہاتھوں میں دولت اور طاقت مرکوز کرنے اور کثیر التعداد لوگوں کو اپنی نفع گیری کے لئے استعمال کرنے کا مقصد رکھتی ہے۔ بالکل ہی باطل ہے۔ موجودہ زمانے میں مشینری کی تنظیم زیادہ تر اسی نمونے کی ہے۔ چرخے کی تحریک مشینری کو اس کی مخصوص اور لوٹ کھسوٹ کرنے والی حیثیت سے ہٹانے اور اسے مناسب حالت میں لانے کی منظمہ کوشش ہے۔ میرے منصوبے کے ماتحت مشینری کے انچارج لوگ صرف اپنے یا اپنی متعلقہ قوم کے متعلق سوچنے کی بجائے ساری نسل انسان کے متعلق سوچا کریں۔

اگر ہندوستان بھی اپنے نفع کی خاطر دوسری قوموں کو استعمال کرنے لگے۔ جیسا کہ یہ صنعتی کارخانے کھلنے پر کرے گا۔ تب یہ دوسری اقوام کے لئے ایک لعنت

اور امن عالم کے لئے ایک خطرہ ہوگا۔ میں کس طرح دوسری قوموں کو اپنے نفع کے لئے استعمال کرنے کے لئے ہندوستان میں کارخانے کھولنے کی خیال کر سکتا ہوں؟ اور کیا تم نہیں جانتے۔ کہ اس حالت کا کیا المناک نتیجہ ہوگا؟ ہم تو تیس کروڑ بے کار انسانوں کو کام میں لگا سکتے ہیں۔ مگر انگلستان تیس لاکھ آدمیوں کو کام پر لگانے کے ناقابل پاکر اپنے روبرو ایسی ایک مشکل کا سامنا پاتا ہے۔ جس کے حل کے لئے انگلستان کے بڑے سے بڑے عقلمند دماغ بھی چکرا رہے ہیں؟ اور اگر مغرب کے لئے صنعتی نظام کا مستقبل تاریک ہے کیا یہ ہندوستان کے لئے تاریک تر نہ ہوگا؟

میں اگر معترض ہوں تو صرف مشینری کے لئے خبط کے خلاف ہوں۔ نہ کہ خود مشینری کے برخلاف۔ خبط جو پیدا ہو رہا ہے۔ وہ محنت بچانے والی مشینوں کے لئے ہے۔ لوگ محنت بچانے میں آگے بڑھے چلے جاتے ہیں یہاں تک ہزاروں لوگ بیکار ہو کر کھلے بازاروں میں بھوک سے مرنے لگے ہیں۔ میں بھی وقت اور محنت بچانے کے حق میں ہوں۔ مگر نوع انسان کے ایک جزو کی بجائے اسے کل انسانیت کے لئے چاہتا ہوں۔ میں چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کی بجائے اسے سب کے ہاتھوں میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ آج مشینری چند لوگوں کو لاکھوں انسانوں کی پشت پر سوار ہونے کے قابل بنا رہی ہے۔ اس کے پیچھے جو محرک ہے۔ وہ محنت بچانے کی فیاضی کی بجائے حرص و ہوا ہے۔ چیزوں کے اس نظام کے خلاف میں اپنی ساری طاقت سے جنگ کر رہا ہوں۔

میرے اپنے کام میں میرا وشواس مجھے سہارا دیتا ہے۔ مزید برآں میں اس امر کا یقین بھی رکھتا ہوں۔ کہ جو چیزیں میرے وشواس کو للکارا کرتی ہیں۔ ان کا

مٹنا اٹل بات ہے ...... مجھے اس امر میں ذرا بھی شک نہیں۔ کہ جب کہ یہ مشینوں کا زمانہ انسانوں کو مشینوں میں بدل رہا ہے۔ میں مشین کی صورت میں بدلے ہوئے انسان کو اس کی اصلی حالت میں لانے کا مقصد رکھتا ہوں۔

میرے دل میں یہ اعتقاد پایا جاتا ہے کہ جب مشینوں کے یہ تمام نمایاں کارنامے ختم ہو چکیں گے۔ یہ دستکاریاں برقرار رہیں گی۔ اور جب کہ تمام نفع گیریاں نہ رہیں گی۔ خدمت اور دیانت والی مزدوری برابر موجود رہیں گے۔ اس وشواس کے سہارے پر ہی میں اپنا کام کئے جاتا ہوں۔..... اپنے کام میں غیر متزلزل اعتقاد نے ہی سٹیفنسن اور کولمبس کو سہارا دیکر برقرار رکھا تھا۔ میرے کام میں میرا وشواس ہی مجھے سہارا دیتا ہے۔

ایک کارخانہ سینکڑوں آدمیوں کو کام پر لگاتا ہوا ہزاروں آدمیوں کو بے روزگار بنا دیتا ہے۔ میں تیل کی مل سے ٹنوں تیل پیدا کر سکتا ہوں۔ مگر میں اس وجہ سے تیل نکالنے والے ہزاروں انسانوں کو بے کار بنا دیتا ہوں۔ میں اس مشینی طاقت کو مسماری خیال کرتا ہوں۔ جبکہ وہ پیداوار جو لاکھوں ہاتھوں کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بہبودی عامہ کے حق میں تعمیری اور مفید اثر رکھتی ہے۔ طاقت سے چلائی جانے والی کلوں کے ذریعے کثیر المقدار پیداوار حکومت کے ماتحت ہونے پر بھی بے سود ہوتی ہے۔

ان لاکھوں زندہ مشینوں کے مقابلے میں جن کی نمائندگی وہ دیہاتی لوگ کرتے ہیں۔ جو ہندوستان کے سات لاکھ دیہات کے اندر بکھرے ہوئے ہیں مردہ مشینوں کو کھڑا کرنا واجب نہیں ہے۔ وہی مشینری جائز طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ جو انسانی کوششوں کی امداد اور اس میں سہولیت پیدا کرتی ہو۔ مشینوں کا موجودہ استعمال چند لوگوں کے ہاتھوں میں دولت جمع کرنے کیطرف

ترقی کا میلان رکھتا ہوا ان مردوں اور عورتوں کے لئے ذرا لحاظ نہیں رکھتا۔ جن کی روٹی اس کے ذریعے ان کے منہ سے چھینی جا رہی ہے۔

لیکن سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں لاکھوں لوگوں کی محنت بچا کر انہیں عقلی مشاغل کے لئے فرصت سے بہرہ ور نہ کیا جائے؟ فرصت ایک حد تک ضروری اور اچھی چیز ہے۔ مگر خدا نے انسان کو پسینہ بہا کر اپنی روزی کمانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اب مجھے یہ ڈراونا منظر دکھلائی دے رہا ہے کہ انسان اپنی تمام ضروریات کو جن میں اس کا سامانِ غذا بھی شامل ہے۔ اپنی ساحرانہ ہیئت سے ہی پیدا کرنے لگا ہے۔

مشینوں کا ہونا اسی حالت میں اچھا ہے۔ جبکہ اس کام کے لئے جو ہمیں کرنا مقصود ہے۔ ناکافی کارندے موجود ہوں)۔ اور ان کا ہونا برا ہے جب کہ جیسا کہ ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے۔ کام کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ کارندے پائے جائیں۔ اب ہمارے روبرو یہ سوال نہیں ہے۔ کہ کس طرح گاؤں میں بسنے والے بے شمار لوگوں کو فرصت سے بہرہ ور کیا جائے۔ بلکہ ہماری مشکل یہ ہے۔ کہ کس طرح ان کے بیکار گھنٹوں کو جو سال میں چھ ماہ کے کام کے دنوں کے برابر ہیں۔ استعمال کیا جائے۔

بیشک رفاہ عام کے کام کے لئے جو انسانی محنت سے نہیں کیا جا سکتا۔ بھاری مشینری کا ہونا لابدی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بھی ضروری ہے۔ کہ وہ حکومت کے ماتحت ہو اور عوام کے فائدے کے لئے استعمال کیا جائے۔ میں اس مشینری کے لئے ذرا لحاظ نہیں رکھ سکتا۔ جو یا تو غرباء کے مقابلہ میں صرف معدودے افراد کو دولت مند بنانے کا اثر رکھتی ہے۔ یا جو بلا سبب کثیر التعداد کی مفید محنت و مزدوری میں مخل ہوتی ہے

مشینری سانپ کے اُس بل کی مانند ہے۔ جس میں یک صد سانپ رہ سکتے ہوں۔ جہاں کہیں مشینیں ہوتی ہیں۔ وہاں بڑے بڑے شہر ہوتے ہیں اور جہاں بڑے بڑے شہر ہوتے ہیں۔ وہاں ٹریم کاریں اور ریلیں بھی ہوا کرتی ہیں اور وہاں صرف بجلی کی روشنی دکھلائی دیتی ہے۔ دیانتدار طبیب تمہیں بتلائیں گے۔ کہ جہاں نقل و حرکت کے وسائل میں ترقی ہوتی ہے۔ وہاں لوگوں کی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے۔......

کثیر المقدار پیداوار استعمال کرنے والے کی حقیقی ضروریات کا کوئی لحاظ نہیں رکھتی۔ اگر کثیر المقدار پیداوار بذاتِ خود ایک خوبی ہوتی۔ تب یہ غیر محدود ترقی کی قابلیت رکھتی۔ لیکن یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے۔ کہ مجموعی پیداوار اپنے اندر ہی اپنی حدود رکھتی ہے۔ اگر تمام ممالک ہی کثیر المقدار پیداوار کے نظام کو قبول کر لیں۔ تب کوئی ایسی منڈی نہیں ملے گی۔ جو ان کی پیداواروں کے لئے کافی ہو اور اس کا لازمی نتیجہ ہو گا۔ کہ کثیر المقدار پیداوار کو بند کرنا پڑے گا۔

میں اپنے اس یقین کو صاف طور پر بیان کروں گا۔ کہ کثیر المقدار پیداوار کا خبط ہی دنیا کی موجودہ نازک حالت کے لئے ذمہ دار ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے یہ بات فرض بھی کر لی جائے۔ کہ مشینری تمام انسانی ضروریات کو مہیا کر سکے گی تو بھی اس کی وجہ سے پیداوار خاص خاص علاقوں میں جمع ہو جائے گی۔ اور اس لئے اس کی تقسیم کے لئے تمہیں پیچیدہ راستے پر چلنا پڑیگا۔ جب کہ پیداوار اور تقسیم ان علاقوں میں ہونے پر جہاں اشیاء مطلوب ہیں۔ یہ خود بخود منضبط ہو جائے گی۔ اور دھوکہ بازی کا کمتر موقع ہو گا۔ اور سٹہ بازی کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ رہے گی۔

جب پیداوار اور تقسیم دونوں ہی مقامی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تب

پیداوار کو کسی بھی قیمت پر غیر محدود درجہ تک بڑھانے کی ترغیب جاتی رہی ہے۔ تب وہ غیر منتہی سوالات اور مشکلات جو موجودہ اقتصادی نظام پیش کر رہا ہے۔ ختم ہو جائیں گی ...... تب چند لوگوں کی جیبوں میں اندوختوں کا اجتماع اور باقی کے لئے افراط کے درمیان غریبی اور محتاجی ناممکن ہو جائیں گے۔

نیز میرے نظام میں دھات کی بجائے مزدوری ہی مروج سکہ ہے۔ وہ ہر شخص جو اپنی مزدوری کا استعمال کرتا ہے۔ یہ سکہ رکھتا ہوا مالدار ہے۔ وہ اپنی محنت کو کپڑے اور اناج میں بدل دیتا ہے۔ اگر اسے پیرافن تیل درکار ہوتا ہے۔ جسے وہ خود پیدا نہیں کر سکتا۔ تو وہ اپنے فالتو اناج کو اس کے حصول کے لئے خرچ کر دیتا ہے۔ یہ آزادانہ۔ منصفانہ اور حاوی شرائط پر تبادلہ محنت ہے۔ اس لئے اس میں کوئی لوٹ کھسوٹ نہیں ہے۔ تم کہو گے۔ کہ یہ تم پرانے دھرانے نظام مبادلہ کی طرف رجعت ہے۔ لیکن کیا تمام بین الاقوامی تجارت اسی اصول مبادلہ پر مبنی نہیں ہے؟

میں مستقبل میں کثیر التعداد پیداوار دیکھ پاتا ہوں۔ مگر وہ طاقت پر مبنی نہ ہوگی۔ سبالآخر چرخے کا پیغام بھی یہی ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی کثیر المقدار پیداوار ہے۔ مگر یہ لوگوں کے اپنے اپنے گھروں میں ہوتی ہے۔ اگر تم انفرادی پیداوار کو لاکھوں گنا کر دو۔ تب کیا یہ عظیم پیمانے پر کثیر المقدار پیداوار نہ ہوگی۔

نظری طور پر میں کل مشینوں کو منسوخ کر دونگا۔ جیسا کہ میں اپنے جسم کو بھی اگر وہ ذریعہ نجات نہ ہو۔ میں ترک کرتا ہوا روح کی نجاتِ کاملہ کا طالب ہونگا۔ اس نقطۂ نگاہ سے میں کل مشینری کو ترک کر دونگا۔ مگر مشینیں موجود رہیں گی۔ کیونکہ وہ بھی میرے جسم کی مانند ضروری ہیں۔ خود جسم میں خالص ترین نمونے کی کل ہی تو ہے۔ لیکن اگر یہ روح کے بلند ترین پرواز میں مانع ہو۔ تب اسے بھی ترک کرنا ہوگا۔

ہندوستان کا مِشن

ہندوستان دراصل کرم بھومی (زمینِ فرض) ہے۔ نہ کہ بھوگ بھومی (زمینِ عیاشی)۔ ہندوستان کو نوعِ انسان کی خاطر اپنی جان قربان کرنے سے پیشتر جینا سیکھنا ہے۔ ہندوستان کی آزادی جنگ اور امن کے متعلق دُنیا کا نقطہ نگاہ بدل ڈالے گی۔ اس کی بے بسی تمام نوعِ انسان پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

میرا مقصد خود مختاری سے برتر ہے۔ میں ہندوستان کی آزادی کی راہ سے ہمیں زمین کی ضعیف ترین نسلوں کو اہل مغرب کی نفع گیری کچلنے والی ایڑیوں سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کی ہر ایک شے مجھے اپنی طرف کھینچا کرتی ہے۔ اس میں وہ ہر ایک شے موجود ہے جس کا اعلےٰ ترین امنگیں رکھنے والا انسان وجود ضرورت مند ہو سکتا ہے

اگر ہندوستان کی آزادی کو سچائی کے بدلے حاصل کرنا پڑے۔ تو میں اس کی

تباہی کو اس کی آزادی پر بدرجہا ترجیح دونگا۔

یوروپ کے قدموں کے آگے چت لیٹا ہوا ہندوستان نوع انسان کے لئے کوئی اُمید نہیں دلا سکتا۔ ایک بیدار اور آزاد ہندوستان دُکھ سے کراہتی ہوئی دنیا کے لئے امن اور خیر خواہی کا پیغام رکھتا ہے۔

یہ بات کہ ہندوستانی لوگ بزدل نہیں ہیں۔ اس کی جنگی نسلوں۔ ہندوؤں مسلمانوں، سکھوں اور گورکھوں کی بہادری اور جرأت سے ثابت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ لڑنے کی سپرٹ ہندوستان کی زمین کے لئے ایک اجنبی شے ہے۔ اور غالباً اسے ارتقائے عالم میں کوئی اعلےٰ تر پارٹ ادا کرنا ہوگا۔ صرف وقت ہی دکھلائے گا۔ کہ اس کی شرکت کیا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کا مقصد زندگی دوسری اقوام سے مختلف ہے۔ ہندوستان دنیا میں مذہبی برتری کے لئے موزونیت رکھتا ہے۔ دُنیا بھر میں اس عمل تزکیہ کی مثال نہیں ملتی جس میں سے ہندوستان گذر چکا ہے۔ ہندوستان کو فولادی اسلحہ کی کمتر ضرورت ہے۔ یہ ایزدی اسلحہ سے جنگ کر چکا ہے۔ اور اب بھی ایسا کر سکتا ہے۔ دوسری اقوام حیوانی طاقت کی حامی چلی آئی ہیں۔ وہ مہیب لڑائی جو یوروپ میں لڑی جا رہی ہے۔ اس سچائی کی زبردست وضاحت کرتی ہے۔ اہل ہند سب کچھ ہی روحانی طاقت سے جیت سکتے ہیں۔ تاریخ اس امر کی بیشمار مثالیں پیش کرتی ہے۔ کہ حیوانی طاقت روحانی طاقت کے روبرو ناچیز شے ہے۔ شاعروں نے اس کے متعلق گیت گائے ہیں۔ اور رشیوں نے اپنے تجربات بیان کئے ہیں۔

میں ہندوستان کو آزاد اور طاقتور اس لئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ نوع انسان کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے خود ایک رضاکارانہ اور پاک قربانی کے

طور پر جینیٹ کر سکے۔ جب فرد خود پاک ہو۔ تب وہ کنبہ کی خاطر، کنبہ گاؤں کی خاطر، گاؤں ضلع کی خاطر۔ ضلع صوبے کی خاطر۔ صوبہ قوم کی خاطر اور قوم کل نوع انسان کی خاطر خود کو ایثار کر دے گا۔

ہندوستان نے کبھی کسی ملک کے خلاف لڑائی نہیں کی۔ البتہ اس نے بعض اوقات صرف اور خالص اپنی حفاظت کی خاطر ناقص اور ادھورے طور پر منظم مزاحمت کی ہے۔ اس لئے اسے روحِ امن کی نشوونما درکار نہیں ہے۔ کیونکہ خواہ وہ جانے اور خواہ نہ جانے۔ اس کے پاس روح امن بافراط موجود ہے۔ اگر وہ دُنیا میں امن کو ترقی پذیر کرنا چاہے۔ تو اس کے لئے یہی طریقہ ہے کہ وہ پُرامن وسائل کے ساتھ دوسری قوموں سے اپنے لوٹے جانے کے خلاف مزاحمت کرے۔ دوسرے الفاظ میں اسے پُرامن وسائل سے ...... خود مختاری حاصل کرنی ہوگی۔ اگر وہ ایسا کر سکے۔ تو امن عالم کے حق میں وہ بڑے سے بڑا اضافہ ہوگا۔ جو کوئی قوم کرنے کے قابل ہے۔

مَیں یہ اعتراف کرنے کی تواضع رکھتا ہوں۔ کہ بہت سی باتیں ہیں۔ جو ہم مغرب سے جذب کرکے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ دانائی کسی براعظم یا نسل کی اجارہ داری نہیں ہے۔ مغربی تہذیب کے خلاف میری مزاحمت دراصل اس بلاتمیز اور بے سوچے سمجھے نقل کی مخالفت ہے۔ جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ایشیائی لوگ صرف یہی قابلیت رکھتے ہیں کہ جو کچھ مغرب سے آئے۔ اس کی نقل کیا کریں۔ میرا زبردست یقین ہے۔ اگر ہندوستان دُکھ کی آگ میں سے گذرنے کا صبر و استقلال اور اپنی تہذیب پر جو ناقص ہونے کے باوجود اب تک زمانوں کے حملوں کا مقابلہ کرتی چلی ہے۔ کسی ناجائز دست درازی کو روکنے کی ہمت رکھتا ہو۔ تب وہ ساری دُنیا کے امن اور اسکی ٹھوس ترقی میں پائیدار اضافہ کر سکتا ہے۔

میں پوری تواضع کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان سچائی اور عدم تشدد کے ذریعے اپنی منزل مقصود پر رسائی حاصل کر سکے۔ تو امن عالم کے حق میں جس کے لئے اقوام عالم پیاسی ہو رہی ہے۔ کوئی قلیل اضافہ نہ ہوگا۔ اور وہ قلیل مقدار میں اس امداد کا معاوضہ ادا کرنے کے بھی قابل ہوگا جو دوسری قومیں اسے کھلے دل سے دیتی رہی ہیں۔

یہ دیکھ کر مجھے درد اور تعجب محسوس ہوتا ہے۔ کہ لوگ آزاد ہند میں اپنے مستقبل کے متعلق پریشانی ظاہر کیا کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس ہندوستان کو آزاد ہند کہنا ہی غلط ہوگا۔ اگر وہ نہ صرف اپنی فرضی حدود بلکہ اپنی قدرتی حدود کے اندر پیدا ہونے والے ادنٰے سے ادنٰے افراد کی آزادی کی ضمانت نہ کرتا ہو۔ ہمارا خوف ہماری سوچنے والی طاقتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ ورنہ ہمیں فوراً جان لینا چاہیئے۔ کہ آزادی کے معنی وہ حالت ہی ہو سکتے ہیں۔ جو بہر حال ہر ایک دیانتدار مرد اور عورت کے لئے موجودہ حالت سے کچھ نہ کچھ بہتر ہی ہوگی آنے والی آزادی سے صرف نفع گیر روپے پر جھپٹا مارنے والے لیٹرے اور ان کی مانند لوگ ہی خائف ہو سکتے ہیں۔

میں ملک کے لئے ایسا آئین مرتب کئے جانے کے لئے کوشش کرونگا۔ جو اسے کل غلامی اور سرپرستی سے آزاد کر کے بالضرورت گناہ کرنے کا بھی حق دینے والا ہوگا۔ میں ایک ایسے ہندوستان کے لئے کام کرونگا۔ جس میں مفلس ترین لوگ بھی محسوس کریں گے۔ کہ یہ ان کا اپنا ملک ہے۔ جس کے بنانے میں مؤثر آواز رکھتے ہیں۔ ایک ہندوستان جس میں لوگوں کی کوئی اعلےٰ اور ادنٰے جماعت نہ ہوگی۔ اور جس میں سب لوگ کامل موافقت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ ایسے ہندوستان میں اچھوت پن کی لعنت یا شراب یا دیگر منشیات کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

عورتیں مردوں کے برابر حقوق رکھیں گی۔ چونکہ باقی ساری دُنیا کے ساتھ ہمارا پُرامن رشتہ ہوگا۔ نہ ہم لوٹنے والے ہوں گے اور نہ کسی سے لُٹے جائیں گے۔ ہم تھوڑی سے تھوڑی فوج رکھیں گے۔ اُن تمام مفاد کا جو بے زبان لکھوکھا انسانوں کے مفاد کے ساتھ کوئی تخالف نہیں رکھتے۔ ان کا خواہ وہ خارجی ہوں اور خواہ اندرونی۔ بڑی احتیاط کے ساتھ احترام کیا جائے گا۔ شخصی طور پر میں ودیشی اور سودیشی کے درمیان امتیاز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یہی میرے خوابات کا ہندوستان ہے......... میں اور کسی شے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

اگر ضرورت پڑے۔ تو میں خونریزہ وسائل کے ذریعے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کی بجائے میں اس کے لئے زمانوں تک منتظر رہ سکتا ہوں۔ میں تقریباً پینتیس سال کے لگاتار سیاسی تجربے کے بعد اپنے دل کی نہایت اندرونی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ دُنیا اب خونریزی سے اس قدر تنگ آچکی ہے۔ کہ اس پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس حالت سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہے۔ اور میں اپنے دل کو اس بات سے خوش کیا کرتا ہوں۔ کہ بھوکی دُنیا کو موجودہ حالت سے نجات پانے کا راستہ دکھلانا شاید اسی قدیم بھارت بھومی کا ہی حصہ ہوگا۔ اس لئے میں دنیا بھر کی قوموں کو اس غرض کے لئے دعوت دینے میں ذرا تامل محسوس نہیں کرتا۔ کہ وہ اس عظیم جدوجہد میں ہندوستان کے ساتھ تہ دل سے تعاون کریں۔ اور یہ نظارہ بلاشبہ تصور کرنے اور دل میں محفوظ رکھنے کے لائق ہے کہ لاکھوں لوگ انتقام گیری کے خیال کے بغیر صرف اس غرض سے دُکھ جھیلنے میں مصروف ہو رہے ہیں۔ کہ قوم کی شان اور عزت کو برقرار رکھ سکیں ؛؛

اگر میں اپنے ملک کی آزادی چاہتا ہوں۔ اور اگر میں شاید اس کے لئے مدد کر سکوں گا۔ تو میں یہ آزادی اس لئے نہیں چاہتا۔ کہ میں جو کل نسل انسان کا پانچواں حصہ آبادی رکھنے والی قوم کا رکن ہونے کی حیثیت سے زمین پر آباد کسی اور نسل یا کسی فرد واحد کو اپنی نفع گیری کے لئے استعمال کر سکونگا۔ اگر میں اپنے ملک کے لئے آزادی چاہتا ہوں۔ تو میں اس آزادی کا مستحق ہی نہ ہوں گا۔ اگر میں اسی آزادی کے لئے ہر ایک دوسری کمزور یا طاقت نسل کے لئے مساوی حق کے خیال کو اپنے دل میں عزیز اور محفوظ نہیں رکھتا۔

جب میں نہیں رہوں گا۔ تب ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اور صرف ہندوستان ہی نہیں۔ بلکہ ساری دنیا آزاد ہو جائے گی۔ میں نہیں مانتا کہ امریکہ یا انگلستان کے لوگ آزاد ہیں۔ وہ اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ رنگ لوگوں کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ میں اپنے مقصد کو جانتا ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ آزادی کیا شے ہے۔ انگریز معلمین نے مجھے اس کے معنی سکھلائے ہیں۔ اور لازمی طور پر میں نے جو کچھ دیکھا اور تجربہ کیا ہے۔ اس کی روشنی میں آزادی کی تعبیر کرتا ہوں۔

گراں قیمتوں کے ادا کئے بغیر آزادی کی لڑائیاں لڑی نہیں جا سکتیں۔ جس طرح انسان اپنے جسم کے علاوہ کسی دوسرے جسم میں جینے کا حق پسند نہیں کر سکتا۔ اسی طرح قوموں کو بھی دوسری قوموں کے ماتحت جینا گوارا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ وہ حکمران قومیں کتنی ہی شریف اور عظیم القدر کیوں نہ ہوں۔ انگریز لوگوں کو جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے عظیم قربانیاں کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے درد کو سمجھنے میں بھی فیل نہیں ہونا چاہیئے۔

دوسری قوموں کے ساتھ ہمارا تہذیبی تعلق

اس سے بڑھ کر کوئی شے بھی میرے خیال سے بعید تر نہیں ہو سکتی۔ کہ ہم دوسری اقوام سے الگ تھلگ ہو رہیں۔ اور اپنے اور ان کے درمیان مضبوط روکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ مگر میں بڑے احترام کے ساتھ یہ کہونگا۔ کہ ہم اپنی تہذیب کے قدرداں ہونے اور اسے جذب کر لینے کے بعد ہی، اس سے پیشتر نہیں۔ دوسری تہذیبات کے قدرداں ہو سکتے ہیں۔ یہ میری پختہ رائے ہے کہ کوئی اور تہذیب ہماری تہذیب کی مانند قیمتی خزانے نہیں رکھتی۔ مگر ہم اس بات کا علم نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمیں اس کے مطالعہ ناپسندیدگی اور اس کی قدر و قیمت کی تحقیر کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہم نے اس تہذیب کے مطابق جینا ہی تقریباً چھوڑ دیا ہے۔ وہ عالمانہ فہم جو اپنے پیچھے عمل نہ رکھتی ہو۔ اس معطر لاش کی مانند ہے۔ جو دیکھنے میں تو خوبصورت معلوم ہوتی ہے مگر جو کوئی ابھار یا شرف نہیں دے سکتی۔ میرا مذہب مجھے دیگر تہذیب کی تحقیر

یا ناقدردانی کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ مدنی خودکشی کے درد کے ماتحت میری اپنی تہذیب کو جذب کرنے اور زندگی میں لانے پر زور دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مغربی تہذیب اہل مغرب کے لئے موزوں ہے۔ لیکن اگر ہم اسے نقل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ تو یہ بات ہندوستان کی تباہی کا موجب ہوگی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کچھ بھی اچھا اور قابل انجذاب ہے۔ ہم اسے قبول اور جذب نہ کریں۔ اور نہ ہی اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ اہل مغرب ان خرابیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہونگے۔ جو اس کے اندر گھس چکی ہیں۔ مادی آسائیشات اور ان کی ترقی کے لئے لگاتار کھینچ اسی قسم کی ایک خرابی ہے اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کہ خود اہل مغرب کو بھی اپنا نقطۂ نگاہ بدلنا پڑیگا۔ اگر وہ ان آسائیشات کے بوجھ تلے دب کر تلف ہونا نہیں چاہتے۔ جن کے وہ غلام ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میری رائے غلط ہو۔ مگر میں جانتا ہوں۔ کہ ہندوستان کا "سنہری اُون" کے پیچھے دوڑنا اپنی موت کو دعوت دلانا ہے ہمیں اپنے دلوں پر ایک مغربی فلاسفر کے اس ضابطۂ عمل کو کندہ کر لینا چاہیئے۔ "سادہ زندگی اور اعلےٰ تفکر"

میں انگریزی کو بین الاقوامی تجارت اور حکمت عملی کی زبان تصور کرتا ہوں۔ اور اس لئے میں اس کے علم کو ہم میں سے بعض کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ چونکہ اس میں خیال اور ادب کے نہایت ہی قیمتی خزانے پائے جاتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے یقینی طور پر اس کے مطالعہ کی توقع رکھتا ہوں۔ جو انسانی استعدادات رکھتے ہیں اور ان سے امید رکھوں گا۔ کہ اپنی قوم کی خاطر اس کے خزانوں کا دلیسی زبانوں میں ترجمہ کریں گے۔

میں اس ہر ایک بات کی جو "قدیم" کہلاتی ہے۔ بلا تمیز اور واہمانہ

پرستش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ مگر اس ہر شے کو مٹانے کے لئے تیار ہوں۔ جو بری اور مخرب اخلاق ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ میں آپ کے روبرو اس امر کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ میں قدیم ادارات کا مداح اور پرستار ہوں۔ اور یہ بات مجھے دکھ دیتی ہے۔ کہ لوگ اپنی قدیم روایات کے باوجود اور انہیں اپنی زندگیوں میں صورت پذیر کرنے کی بجائے ہر ایک نئی چیز کے پیچھے دوڑنے لگ جاتے ہیں۔

جبکہ میں مغربی تہذیب کا مرہون منت ہونے کا معترف ہوں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنی قوم کی جتنی خدمت بھی کر سکا ہوں۔ وہ بالکل ہی مشرقی تہذیب کو حتے الامکان برقرار رکھنے کا نتیجہ ہے۔ اگر میں انگلستان کا پیرو ہو کر اپنی قومیت کی حس کو کھو بیٹھتا۔ اور عوام کو نہ جانتا یا ان کی کمتر پرواہ کرتا یا شاید ان کی عادات۔ خیالات اور امنگوں سے نفرت کرنے والا ہوتا۔ تو میری ہستی عوام کے لئے بالکل ہی بے سود ہوتی۔

یہ (ہندوستانی تہذیب) ان تہذیبات کی آمیزش ہے۔ جنہیں مختلف مذاہب ظاہر کرتے ہیں۔ اور جن پر ان جغرافی اور دیگر حالات نے اثر ڈالا ہے جن میں ان تہذیبات کا باہمی ملاپ ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تہذیب عرب۔ ترکی۔ مصر اور ہندوستان میں یکساں طرز کی نہیں ہے۔ کیونکہ خود یہ متعلقہ ممالک کے حالات سے متاثر ہوئی ہے۔ اس لئے ہندوستانی تہذیب ہندوستانی ہے۔ یہ بالکل ہی ہندو یا اسلامی یا کوئی اور تہذیب نہیں ہے۔ اور ہر شخص جو خود کو ہندوستانی خیال کرتا ہے۔ فرض ہے کہ اس تہذیب کا قدردان ہوتا ہوا اس کا امین ہوتا ہوا۔ اس پر ہر ایک حملے کی مزاحمت کرے۔

محنت اور مشقت!

خدا نے انسان کو اپنی خوراک کے لئے خود کام کرنے کے لئے پیدا کر کے کہا۔ کہ جو لوگ کام نہیں کرتے وہ چور ہیں۔

بیکار اور بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کے لئے صرف وہی خدا قابل قبول ہو سکتا ہے۔ جو ان کے روبرو کام اور بطور اُجرت خوراک کے وعدے کی صورت میں نمودار ہونے کی جرأت رکھتا ہے۔

میں ان محنت مزدوری کرنے والے اور لاکھوں بیکار لوگوں کی خاطر سوراج حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ جنہیں دن میں ایک بار بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ اور جو ایک سڑی باسی روٹی اور نمک کی چٹکی پر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

برہما نے اپنی پرجا کو پیدا کر کے ان پر یگیہ کا فرض عائد کر کے کہا۔ "اس کے ذریعے تم پھولو پھلو۔ یہی تمہاری سب خواہشات کو پورا کرنے والا ہو گا"

گیتا کہتی ہے کہ جو شخص اِس یگیہ کے کئے بغیر کھانا کھاتا ہے۔ وہ چرائی ہوئی غذا کھاتا ہے۔" بائیبل کہتی ہے۔ "پسینہ بہا کر اپنی روٹی کماؤ۔"

یگیہ کئی طرح کا ہو سکتا ہے۔ اور ان میں سے ایک قسم روٹی کے لئے محنت و مشقت ہو سکتا ہے۔ اگر سب لوگ اپنی روٹی کے لئے محنت کرتے ہوئے اور کچھ نہ چاہتے۔ تب بھی کافی خوراک اور فرصت حاصل کر سکتے تھے۔ تب حد سے زیادہ آبادی، بیماری اور ایسی مصیبت کی جو ہم اپنے چاروں طرف دیکھ پاتے ہیں۔ کوئی فریاد نہ اُٹھتی۔ ایسی محنت یگیہ کی اعلےٰ ترین صورت ہے بے شک لوگ اپنے اجسام یا اپنے ذہنوں کے لئے اور کئی کام کریں گے۔ مگر وہ سب کے سب عام بھلائی کی خاطر محبّت کی محنت ہوں گے۔ تب کوئی بھی امیر یا غریب یا اعلےٰ یا ادنےٰ اچھوتے کے قابل یا اچھوت نہ ہوگا۔

کام پر حد سے زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔ (یعنی جس قدر زور دیا جائے تھوڑا ہے) میں صرف گیتا کا اُپدیش دہرا رہا ہوں۔ جس میں بھگوان کہتے ہیں "اگر میں سستی کے بغیر سدا کام میں مصروف نہ رہتا۔ تب میں نوع انسان کے روبرو ایک غلط مثال پیش کرنے والا ہوتا۔"

اگر میں بُدّھ سے روبرو ملاقات حاصل کرنے کی خوش قسمتی رکھتا۔ تو میں اُس پر یہ سوال کرنے میں ذرا تامل نہیں نہ کرتا۔ کہ کیوں کر اُس نے لوگوں کو دھیان پر کرم کی ترجیح دینا نہیں سکھلایا تھا۔ اور اگر مجھے تکارام اور گیان دیو ایسے سنتوں سے ملنے کا موقع ملتا۔ تو ان پر بھی میرا یہی سوال ہوتا۔

چرخہ میرا یقین ہے کہ صرف عدم تشدد کا راستہ ہی ہندوستان کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ اور ہندوستان کے لئے

اس دھرم کا نشان چرخہ ہے۔ کیونکہ یہی مصیبت زدوں کا دوست اور غربا کو خوشحال کرنے والا ہو سکتا ہے۔ قانونِ محبت مکان و زمان کی حدود کو نہیں جانتا۔ میرا سوراج بھنگیوں ڈھیڈوں۔ دبلوں اور ادنےٰ سے ادنےٰ لوگوں کا خیال رکھتا ہے۔ اور چرخے کے سوا مجھے اور کوئی شے معلوم نہیں ہے جو ان سب کی رفیق ہو سکے۔

اگر میں زمانہ حال کی حسی لذت کی مصنوعی زندگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں اس سادگی کی طرف پیچھے کو لوٹنے کی ہدایت کرتا ہوں جس کا نمونہ چرخہ ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ سادگی کی طرف فہمیانہ مراجعت کے بغیر ہم حیوانیت کے مرتبہ سے بھی نیچے گرنے سے بچ نہیں سکتے۔

میرا خدا بے شمار شکلیں رکھتا ہے۔ اور جب کہ میں اسے بعض اوقات چرخہ کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ دوسرے اوقات میں فرقہ وارانہ اتحاد کی صورت میں اس کا دیدار پاتا ہوں۔ اور پھر کبھی تو وہ مجھے اچھوت پن کے دفعیہ میں نظر آنے لگتا ہے۔ اور اسی طور سے ہی جس جس طریق سے روح مجھے متحرک کرتی ہے۔ میں اس کے ساتھ اپنا رابطہ (یوگ) قائم کرتا ہوں۔

میں نہیں جانتا کہ میں کرم یوگی یا کسی قسم کا یوگی ہوں۔ میں اسی قدر جانتا ہوں۔ کہ میں کام کئے بغیر جی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس بات کی تمنا ہے۔ کہ جب میں مروں۔ میرے ہاتھ میں چرخہ موجود ہو۔ اگر انسان کو خدا کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لئے کوئی وسیلہ درکار ہوتا ہے۔ تو چرخے کو ہی ایسا دھن کیوں نہ قرار دیا جائے؟

گیتا کہتی ہے کہ جو شخص میری پوجا کرتا ہے۔ میں اسے سیدھا مارگ دکھلاتی ہوئی اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہوں۔

قومیت اور بین الاقوامیت

(نیشنلزم اور انٹرنیشنلزم)

میرے لئے وطن دوستی اور انسانیت ایک ہی شے ہیں۔ میں اس لئے وطن دوست ہوں۔ کہ میں انسان اور رحم دل ہوں۔ میری وطن دوستی کسی کو خارج نہیں کرتی۔ میں ہندوستان کی خدمت کے لئے انگلینڈ یا جرمنی کو نقصان نہیں پہنچاؤنگا۔ میری زندگی کے خاکے میں نوکر شاہی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وطن دوست کا قانون قبیلہ کے قانون سے مختلف نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی وطن دوست سرگرم انسان دوست نہ ہو۔ تو وہ اسی نسبت سے گھٹیا درجے کا وطن دوست ہوگا۔ شخصی اور سیاسی قانون میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

میں خدا کا روبرو دیدار حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے جس خدا کا علم ہے وہ سچائی ہے۔ میرے لئے خدا سے ملنے کا یقینی اور واحد وسیلہ عدم تشدد۔ اہنسا۔ محبت ہے۔ میں ہندوستان کی آزادی کے لئے جیتا ہوں اور اسی کے لئے ہی مرنا چاہتا ہوں۔

اس لئے کہ یہ سچائی کا ایک جزو ہے۔ صرف آزاد ہند ہی حقیقی خدا کی پرستش کر سکتا ہے
میں ہندوستان کی آزادی کے لئے اس لئے کام کرتا ہوں۔ کہ میری سودیشی مجھے سکھلاتی ہے۔ کہ اس جگہ پیدا ہوا اور اس کی ترقی و تہذیب کا وارث ہونے کی وجہ سے میں اس کی خدمت کے لئے نہائیت موزوں ہوں۔ اور ملک میری خدمت پر سب سے پہلا حق رکھتا ہے۔
میں اپنے ملک کے لئے اس لئے آزادی کا طالب ہوں۔ کہ دوسرے ملک میرے آزاد ملک سے کچھ سیکھ سکیں۔ اور میرے ملک کے ذرائع نوع انسان کی بہبودی کے لئے استعمال کئے جا سکیں۔

اگر ہندوستان تشدد کو اپنا مسلک بنا لے۔ اور میں زندہ رہوں۔ تو میں ہندوستان میں بسنا منظور نہیں کرونگا۔ کیونکہ تب ہندوستان میرے اندر کوئی فخر پیدا نہیں کر سکے گا۔ میری وطن دوستی میرے مذہب کے تابع ہے۔ میں ہندوستان کے ساتھ اسی طرح چمٹا رہونگا جس طرح کہ بچہ ماں کی چھاتی سے لپٹا رہتا ہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے وہ روحانی غذا دیتا ہے۔ جس کی مجھے ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسا ماحول رکھتا ہے۔ جو میری اعلیٰ ترین تمناؤں کو پورا کرتا ہے۔ جب میرا یہ عقیدہ جاتا رہے گا تب میں اس بچے کی مانند خود کو یتیم محسوس کرونگا۔ جو اپنے لئے کوئی والی پالنے کی امید نہیں رکھ سکتا۔

جس طرح آج وطن دوستی کا مسلک ہمیں سکھلاتا ہے۔ کہ فرد کو اپنے خاندان کیلئے، خاندان کو گاؤں کے لئے۔ گاؤں کو ضلع کے لئے ضلع کو صوبہ کے لئے اور صوبہ کو ملک کے لئے جان نثار کر دینی چاہیئے۔ اسی طرح ہی کسی ملک کو بھی اس لئے آزاد ہونا چاہیئے۔ کہ وہ بالضرورت کل دنیا کی بھلائی کے لئے خود کو نثار کر سکے۔ اس لئے قومیت کے لئے میری محبت یا قومیت کے متعلق میرا خیال اس لئے وجود رکھتا ہے۔ کہ میرا ملک آزاد ہو جائے۔ اور اگر ضرورت پڑے۔ تو نوع انسان کی بقا کے لئے میرا سارا ملک ہی مرنے

نے لئے تیار ہوسکے۔ اس میں نسلی نفرت کے لئے ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ ہماری قومیت پرستی ایسی ہی ہونی واجب ہے۔

میں اسلئے ہندوستان کو عروج پذیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ اس سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچ سکے۔ میں دوسری قوموں کے کھنڈروں پر ہندوستان کا عروج دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے اگر ہندوستان قوی تر اور آزاد ہوگا۔ تو وہ دنیا کو آرٹ اور صحت بخش مصالحات کے خزانے دینے کے قابل ہوگا۔ مگر وہ دنیا کی طرف افیون یا شراب بھیجنے کے لئے کبھی رضامند نہ ہوگا۔ اگرچہ اس سے اُسے کتنا ہی مالی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔

میں کل دنیا کی اصطلاحات میں سوچنا چاہتا ہوں۔ میری وطن دوستی میں نوع انسان کی عام بہبودی شامل رہتی ہے۔ اس لئے جب میں ہندوستان کی خدمت کرتا ہوں تب اس کے اندر کل نوع انسان کی خدمت میں موجود ہوتی ہے۔ ...... ہندوستان کی آزادی کے لئے میرا اسرار اخاکہ اندرونی طاقت کی نشوونما پر مبنی ہے یہ تزکیۂ نفس (آتم شدھی) کا منصوبہ ہے۔ اس لئے اہل مغرب ہندوستانی تحریک کی اسطور سے مدد کر سکتے ہیں۔ کہ وہ ماہرین خصوصی کو اس آتم شدھی کی باطنیت کے مطالعہ کے لئے خاص طور پر متعین کریں۔ ایسے ماہرین خصوصی کو کھلے دل کے ساتھ ہندوستان میں آکر امن و انکسار کے ساتھ کھوج کرنی چاہیئے۔ جو طالب حق کے سلئے موزوں ہے۔

میرے لئے یہ بات ناممکن ہے کہ میں قوم پرست ہوئے بغیر بین الاقوامیت کا حامی ہو سکوں۔ بین الاقوامیت کی روح اس وقت ہی بیدار ہو سکتی ہے جبکہ قومیت ایک امر واقعہ ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں جب کہ دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے والے لوگ باہم منظم ہو کر ایک شخص واحد کی مانند کام کرنے کے قابل ہوں۔ قومیت بذات خود کوئی بری شے نہیں ہے۔ اگر برائی ہے۔ تو اس تنگدلی۔ خود غرضی اور علیحدگی میں ہے جو عہد حاضرہ کی اقوام کے لئے زہر ثابت ہو رہی ہے۔ ہر ایک قوم دوسری قوم کے

استخفاف یا تذلیل سے فائدہ اُٹھانا۔ اور اس کے کھنڈر پر اپنی ترقی کی عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ مگر ہندوستانی قومیت نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ یہ خود منظم ہو جائے یا کل نوع انسان کی بہبودی اور خدمت کی خاطر اپنی خود اظہاری کا موقع پائے مجھے خدا نے اہل ہند کے درمیان پیدا کیا ہے۔ اگر میں ان کی خدمت نہ کر سکوں۔ تب میں اپنے خالق کے روبرو جھوٹا ثابت ہونگا۔ اگر میں ان کی خدمت کرنا نہیں جانتا تو نوع انسان کی خدمت کرنا بھی نہیں جان سکتا۔ اور جب میں دوسری قوموں کو نقصان نہ پہنچاؤں۔ تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اپنے ملک کی خدمت کرتا ہوا گمراہ ہو جاؤں۔ میں نے ہندوستان کے روبرو ایک جدید اور بے نظیر اوزار پیش کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح تر ہوگا۔ کہ میں نے ایک قدیم اور آزمودہ اوزار کے استعمال کو وسعت دی ہے۔ میں اسے ملک کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ میں اسے اپنے لئے استعمال کر سکتا ہوں۔ اور ایسا کر کے خود کو آزاد محسوس کرتا ہوں۔ دوسروں نے بھی ایسا کر کے یہی احساس پایا ہے۔ اگر قوم اس اوزار کو استعمال کرے گی تو وہ بھی آزاد ہو جائے گی۔

میں تقریری یا تحریری لفظ کی طاقت سے بڑھ کر قوتِ خیال میں یقین رکھتا ہوں۔ اور اگر وہ تحریک جس کا میں نمائندہ ہوں۔ اپنے اندر قوتِ حیات رکھتی ہوئی برکتِ ایزدی سے بے نصیب نہیں ہے۔ تو یہ دُنیا کے مختلف حصوں میں میری جسمانی موجودیت کے بغیر ہی سرائت کر جائے گی۔ ساری دُنیا میں اگر مجھے غرور کے بغیر اور انکسار کے ساتھ کہنے کی اجازت ہو۔ تو میں کہونگا کہ میرا پیغام اور میرا طریقہ اپنے اصول کے لحاظ سے درحقیقت ساری دُنیا کے لئے ہیں۔ اور یہ بات مجھے گہری تسلی دیتی ہے کہ اسے مغرب کے مردوں اور عورتوں کی دن بدن ترقی پذیر اور عجیب قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

میں اپنی کمزوریوں کے باوجود جن سے میں دردناک طور پر آشنا ہوں۔ میں کسی طرح سے محسوس کرتا ہوں۔ کہ میرے تجربے کا ایک حصہ زمین پر محدود رہنا ضروری ہے۔ اور اگر یہ ایک حصے میں درست ثابت ہو جائے۔ تب یہ غالباً کل دنیا کے لئے صحیح ثابت ہوگا...... میں ساری دنیا کی امداد کے لئے تڑپ رہا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔ کہ یہ امداد آ رہی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ یہ امداد ایک ایسے عظیم سیلاب کی مانند حاصل ہو۔ جو پاکیزہ بناتا اور طاقت بخشتا ہے۔ ہمیں اس کا مستحق بننا ہوگا۔

میرا مشن صرف ہندوستان کی اخوت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرا مقصد صرف ہندوستان کی آزادی ہے۔ اگرچہ آج کل یہ خیال میری ساری زندگی اور میرے سارے وقت کو پُر کئے ہوئے ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے پر اس مشن کو ساری دنیا میں پھیلانے کے قابل ہونگا۔ میری وطن دوستی کسی کو خارج نہیں کرتی۔ اس میں ہر ایک کے لئے گنجائش ہے۔ اور میں اس وطن دوستی کو ترک کر دینا چاہتا ہوں۔ جو دوسری اقوام کو نقصان پہنچانا یا ان کی لوٹ کھسوٹ کرنا چاہتی ہے۔ میرا وطن دوستی کا تصور کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ سارا اور ہر حالت میں بلا استثنےٰ کل نوع کی عام ترین بھلائی کے ساتھ موافقت نہ رکھتا ہو صرف اسی پر ہی بس نہیں۔ میرا مذہب اور میری وطن دوستی جو میرے مذہب کا نتیجہ ہے۔ کل زندگی سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ میں صرف انسانی افراد کے ساتھ ہی نہیں۔ بلکہ کل زندگی اور ان جانداروں کے ساتھ جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں۔ اپنا برادرانہ یا عینیت کا رشتہ محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے لئے میرا یہ کہنا صدمہ رساں نہ ہو تو میں کہوں گا۔ کہ میں زمین پر رینگنے والے جانداروں کے ساتھ اس لئے رشتہ عینیت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہم سب ایک ہی خدا سے نمودار ہوئے ہیں۔ اور

اس لئے کل زندگی ہی خواہ وہ کسی صورت میں ظہور پذیر ہو۔ ایک ہی ہے۔

ہماری قومیت دوسری قوموں کے لئے خطرہ ثابت نہ ہوگی۔ کیونکہ ہم کسی کی لوٹ کھسوٹ کو اسی طرح ہی پسند نہیں کرتے۔ جس طرح کہ ہم کسی دوسری قوم کو بھی اپنی لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہم سوراج کے ذریعے کل دُنیا کی خدمت کریں گے۔

مَیں ہندوستان کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ اور ہندوستان کی خدمت کی راہ سے کل نوع انسان کی خدمت کرتا ہوں۔ پنجاہ سالہ کی بیباک زندگی کے بعد آج میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ میرا یہ عقیدہ کہ اپنی قوم کی خدمت ساری دُنیا کی خدمت کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتی۔ اور بھی مضبوط ہوگیا ہے۔ یہ ایک اچھا عقیدہ ہے۔ اور اسی کی قبولیت ہی دُنیا میں موجب امن ہو کر ساری زمین پر بسنے والی قوموں کے درمیان باہمی حسد و بغض کی پیدائش کو روک سکتا ہے۔

آزادی اور باہمی اِنحصار

دُنیا کا بہترین ذہن ایسی قطعاً آزاد حکومتوں کو نہیں چاہتا۔ جو ایک دُوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہوں۔ بلکہ باہمی طور پر منحصر اور محبانہ حکومتوں کی رِفاقیت کا خواستگار ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس واقعہ کی تکمیل بعید زمانے سے متعلق رکھتی ہو۔ مَیں اپنے مُلک کے لئے کوئی بہت بڑا دعوےٰ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر آزادی کی بجائے عالمگیر باہمی انحصار کے لئے ہماری آمادگی کے اظہار میں مجھے کوئی بھی عظیم دعوےٰ یا عدم امکان دکھائی نہیں دیتا۔ مَیں باہمی انحصار کا مدعی ہوئے بغیر مکمل آزادی کی قابلیت چاہتا ہوں۔ ہر ایک منصوبہ جو مَیں تیار کرونگا۔ بحالیکہ اِنگلستان ہندوستان کو کل برطانوی سلطنت کے ساتھ پوری مساوات دینے کا مقصد رکھتا ہو۔ وہ اتحاد کے بغیر باہمی انحصار کی بجائے اتحاد کا منصوبہ ہوگا۔

جداگانہ آزادی حاصل کرنا دُنیا کے ملکوں کا مقصد نہیں ہے۔ اُن کا مقصد

رضا کارانہ باہمی انحصار ہے۔

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ انسان کی مجلسی فطرت ہی اسے دیگر حیوانی مخلوقات پر امتیاز بخشتی ہے۔ اگر وہ آزادی حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ تو باہمی انحصار کا تعلق قائم کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ صرف ایک مغرور انسان ہی اور کسی پر انحصار نہ رکھنے اور بذاتِ خود کافی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے۔

میں اس بات کو نہیں مان سکتا۔ کہ کوئی شخص روحانی طور پر ترقی کر سکتا ہے جبکہ اس کے ارد گرد بسنے والے لوگ دُکھ میں مبتلا ہو رہے ہوں۔۔۔۔ میں ادویت (عدم ثنویت) کا قائل ہوں۔ اور میں انسان کی ذاتی وحدت کا معتقد ہوں۔ اور اسی وجہ سے میں کل جانداروں کی وحدت میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ اور اس لئے میرا یقین ہے۔ کہ اگر ایک شخص روحانی طور پر ترقی کرے۔ تب ساری دُنیا ہی اس کے ساتھ ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اور اگر زوال پذیر ہو۔ تو ساری دُنیا ہی اسی قدر گر جایا کرتی ہے۔

کل نوع انسان ایک ہے۔ کیونکہ ہم سبھی قانونِ اخلاق کے تابع ہیں۔ خدا کی نظر میں تمام انسان مساوی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نسل حسب وغیرہ کے امتیازات پائے جاتے ہیں۔ مگر انسان جس قدر اُوپر اٹھتا ہے۔ اسی قدر ہی اس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔

کوئی بھی ایسی نیکی وجود نہیں رکھتی۔ جس کا مقصد صرف انفرادی بہبودی ہو یا جو انفرادی بہبودی پر ہی مطمئن رہ سکتی ہو۔ اس کے خلاف کوئی بھی ایسا جرم نہیں ہے۔ جو مجرم کے علاوہ دوسروں پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اثر نہ ڈالتا ہو۔ اس لئے کسی فرد کا بھلا یا بُرا ہونا صرف اس انفرادی معاملہ ہونے کی بجائے ساری قوم بلکہ ساری دنیا کا معاملہ ہے۔

باہمی انحصار بھی انسان کا اُسی طرح ہی تقیب العین ہونا چاہیئے۔ جبکہ بذاتِ خود کافی ہونا۔ انسان ایک مجلسی وجود ہے۔ وہ سوسائیٹی کے ساتھ باہمی تعلق رکھے بغیر نہ تو ساری کائینات کے ساتھ اپنی وحدت کو محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی خودی کو مٹا سکتا ہے۔ اس کا مجلسی طور پہ باہمی انحصار ہی۔ اسے حقیقت کی کسوٹی پر اپنے عقیدے اور اپنے آپ کو پرکھنے کے قابل بناتا ہے اگر انسان ایسی حالت میں رہ سکتا یا رکھا جاتا۔ کہ وہ اپنے ابنائے جنس پر کوئی انحصار نہ رکھتا۔ تو وہ اس قدر مُعجب اور مغرور ہو جاتا۔ کہ وہ دُنیا کے لئے سچ مچ ایک بوجھ اور وبالِ جان ثابت ہوتا۔ سوسائیٹی پر انحصار ہی اسے انسانیت کا سبق سکھاتا ہے۔ یہ بات تو صاف عیاں ہے۔ کہ انسان کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے قابل ہونا چاہیئے۔ مگر یہ بات بھی اس سے کمتر عیاں نہیں ہے کہ جب بذاتِ خود کافی ہوتا۔ دوسروں سے علیحدگی کی صورت اختیار کرے۔ تو وہ ایک گناہ ہو جاتا ہے۔ انسان روئی بونے اور سوت کاتنے کے اعمالِ مختلفہ میں بھی بذاتِ خود کافی نہیں ہو سکتا۔ اسے کسی نہ کسی مرحلے پر اپنے کنبے کے افراد کی مدد لینی ہی پڑتی ہے۔ اور اگر وہ اپنے کنبے سے مدد لے سکتا ہے۔ تو کیوں اپنے پڑوسی سے امداد حاصل نہ کرے۔ ورنہ وہ عظیم مقولہ کیا معنی رکھ سکیگا کہ "ساری دُنیا میں میرا اپنا پریوار ہے۔"

اِشتمالیت واِشتراکیت

(کمیونزم اور سوشلزم)

مَیں جلدی سے تشدّد کے ذریعے حاصل ہونے والی کامیابیوں میں یقین نہیں رکھتا۔ اگرچہ میں اچھّے محرکات سے کتنی ہی ہمدردی رکھوں۔ اور ان کی کتنی ہی تعریف کروں۔ مَیں ان تشدّد آمیز طریقوں کا سخت مخالف ہوں۔ جو بہترین قسم کے مقاصد رکھتے ہوں۔ اس لئے مدرسۂ تشدّد اور میرے درمیان ملاپ کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ مگر عدم تشدد میں میرا اعتقاد مجھے ان تمام لوگوں سے بھی ملنے جلنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جو لانظمی پسند یا تشدد کے حامی ہیں لیکن میرا یہ میل جول ہمیشہ اسی غرض سے ہوتا ہے۔ کہ انہیں اس بات سے ہٹا سکوں۔ جو مجھے غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ مجھے تجربے نے سکھلا دیا ہے۔ کہ پائیدار بھلائی کبھی جھوٹ اور تشدد کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اور اگر میرا یہ اعتقاد ایک فریبِ نظر بھی ثابت ہو جائے۔ تو بھی یہ فریب نظر ایک دلکش فریب نظر ہے۔

اشتمالیت انجام کار کیا معنی رکھتی ہے؟ اس کے معنی وہ سوسائٹی ہیں۔ جو کوئی جماعات نہیں رکھتی۔ اور یہ مقصد واقعی طور پر قابل حصول ہے۔ میں اس سے صرف اس وقت الگ ہو جاتا ہوں۔ جبکہ اس کے حصول کے لئے طاقت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم سب مساوی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن ہم اب تک خدا کے ارادہ کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔ عدم مساوات اور اونچ نیچ کا خیال ایک برائی ہے۔ لیکن میں سنگین کے زور سے اس برائی کو انسانی دل سے مٹانا نہیں چاہتا۔ انسانی دل اس ذریعے کو قبول نہیں کرتا۔

میں معترف ہوں کہ میں اب تک بالشوزم کے معنوں کو پوری طرح سمجھنے میں قاصر ہوں۔ مجھے صرف اس قدر معلوم ہے۔ کہ اس کا مقصد پرائیویٹ ملکیت کا خاتمہ کرنا ہے۔ اور یہ صرف عالم اقتصادیات میں کچھ بھی اپنے قبضہ میں نہ رکھنے کے اصول کا استعمال ہے۔ اور اگر لوگ اس معیار کو اپنی مرضی سے یا پُر امن فہمائش کے ذریعے قبول کر سکیں۔ تو اس سے بڑھ کر کیا اچھائی ہو سکتی ہے؟ مگر مجھے بالشوزم کے متعلق جو کچھ معلوم ہے۔ اسی کے مطابق یہ نظام نہ صرف طاقت کے استعمال کو ممنوع قرار نہیں دیتا۔ بلکہ پرائیویٹ جائداد کو چھیننے اور اجتماعی طور پر اسے قبضے میں رکھنے کے لئے طاقت کے استعمال کے لئے کھلی چھٹی دیتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہو۔ تب یہ کہنے میں مجھے ذرا تامل نہ ہوگا۔ کہ بالشویک نظام اپنی موجودہ صورت میں بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکیگا۔ کیونکہ میرا یہ پختہ یقین ہے۔ کہ کوئی شے بھی جو تشدد پر مبنی ہو۔ پائدار نہیں رہ سکتی۔ مگر کچھ بھی ہو۔ اس میں ذرا شک کی گنجائش نہیں ہے۔ کہ بالشوزم کی پشت پر ان انگشت مردوں اور عورتوں کی پاکیزہ ترین قربانی موجود ہے۔ جنہوں نے اس کے لئے اپنا سب کچھ نثار کر دیا ہے ایسا آدرش جسے لینن کی مانند عظیم الشان روحوں کی حمایت حاصل ہو رائیگاں

نہیں جا سکتا۔ ان کے ترک کی شاندار مثالی سدا شعلہ زن رہ کر مرورِ زمانہ کے ساتھ اس معیار کو زندگی اور پاکیزگی دیتی رہے گی۔

جب میں روس کو دیکھتا ہوں جس میں مشینوں کے ذریعے اجرائے صنعت کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے۔ تب اس ملک کی زندگی مجھے خدا کشش نہیں کرتی۔ بائبل کے الفاظ میں "اپنی روح کھو کر ساری دُنیا مل جانے پر بھی انسان کیا حاصل کرے گا؟" عہد حاضر کی بولی میں یہ بات انسانی شان و عظمت سے نچلے درجے کی ہے۔ کہ وہ اپنی انفرادیت کو کھو کر صرف مشین کا پرزہ ہی ہو رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک فرد سوسائیٹی کا پُرجوش اور پورے طور پر نشوونما یافتہ رکن ہو۔

حقیقی اشتراکیت ہمیں اپنے ان بزرگوں سے ورثہ میں ہاتھ آئی ہے۔ جو یہ سکھلاتے تھے کہ "ساری زمین گوپال (خدا) کی ہے۔ اس کی سرحد کہاں ہے؟" گوپال کے لفظی معنی گڈریا کے ہیں۔ اس کے معنی خدا بھی ہیں۔ اور موجودہ بولی میں اس کے معنی حکومت یا عوام ہیں۔ یہ بات درست ہے۔ کہ آج زمین پر عوام کی ملکیت نہیں ہے۔ مگر یہ تعلیم کا قصور نہیں ہے۔ قصور ہمارا ہے۔ جنہوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور میں اس امر میں ذرا شک نہیں رکھتا۔ کہ ہم بھی اس معیار پر اسی طرح ہی بلا تشدد رسائی حاصل کرنے کے قابل ہیں۔ جیسے کہ کوئی اور ملک حاصل کر سکتا ہے۔ اور روس بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ لوگوں کو تشدد آمیز طریق سے بے قبضہ کرنے کا نہایت ہی موثر بدل اپنے مفہومات کے ساتھ چرخہ ہے۔ زمین اور ساری جائداد اسی کی ہے۔ جو کام کرتا ہے۔ بدقسمتی سے کام کرنے والے اس سیدھی سادی بات سے بے خبر ہیں یا انہیں بے خبر رکھا گیا ہے۔

روس کے نمونے کی اشتمالیت جو لوگوں پر ٹھونس دی گئی ہے۔ ہندوستان کے لئے گھناونی ہو گی۔ اگر اشتمالیت تشدد کے بغیر یہاں آئے۔ تو اسے خوش آمدید کہا

جائے گا۔ کیونکہ اس حالت میں اگر کوئی شخص جائداد رکھیگا۔ تو وہ عوام کی طرف سے اور عوام کی خاطر ہی ایسا کریگا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لکھ پتی لاکھوں روپے رکھتا ہو۔ مگر وہ سب کچھ عوام کے لئے ہی رکھتا ہو۔ اور جب ملک کو ان کے عام استعمال کی ضرورت ہوگی۔ وہ اس دولت کو سنبھال لے گا۔

اہل سرمایہ کے سرمایہ کے وبال جان ہونے کی دریافت سے اشتراکیت کی پیدائش نہیں ہوئی۔ جب کہ میرا دعوے ہے۔ کہ اشتراکیت، بلکہ اشتمالیت بھی ایش اپنشد کے پہلے شلوک میں مفہوم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب بعض ریفارمر انسانی فطرت کی تبدیلی میں اپنا عقیدہ کھو بیٹھے۔ تب سائنٹیفک طرز کی اشتراکیت کا طریق عمل وجود میں آگیا۔ میں بھی اسی سوال کے حل میں مصروف ہوں۔ جو سائنٹیفک اشتراکیت پسندوں کے روبرو درپیش ہے۔ مگر یہ بات درست ہے۔ میں اس سوال کو ہمیشہ اور صرف خالص عدم تشدد کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہوں۔

اقتصادیات اور اخلاقیات

وہ اقتصادیات جو اخلاقی اور جذباتی امور کو ملحوظ نہیں رکھتی۔ ان موم کی پتلیوں کی مانند ہے۔ جو جاندار معلوم ہوتی ہوئی اپنے اندر کوئی زندہ گوشت نہیں رکھتیں۔ ہر ایک نازک لمحے پر یہ نئے گھڑے ہوئے اقتصادی قوانین عمل میں بالکل ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور جو اقوام یا افراد انہیں راہنمائی کرنے والے عملی اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ لازمی طور پر تباہ ہو جاتے ہیں۔

وہ اقتصادیات جھوٹی قسم کی ہے۔ جو اخلاقی قدر کے لئے کوئی لحاظ نہیں رکھتی۔ اقتصادیات کے حلقے کے اندر عدم تشدد کے قانون کی توسیع کم از کم یہ معنی رکھتی ہے۔ کہ بین الاقوامی تجارت کے انضباط کی خاطر اخلاقی قدر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

میں اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ میں اقتصادیات اور اخلاقیات کے درمیان کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ وہ اقتصادیات جو فرد یا قوم کی اخلاقی بہبود کی

کے حق میں مضر ثابت ہو۔ وہ منافیٔ اخلاق ہونے کے باعث گنہگارانہ ہے۔ پس جو اقتصادیات ایک ملک کو دوسرے ملک کا شکار بناتی ہے۔ بداخلاق ہے۔ ان اشیاء کو جو مزدوروں کا خون چوس کر تیار کی گئی ہوں۔ خریدنا اور برتنا ایک گنہگارانہ فعل ہے

میری رائے میں ہندوستان اور اس لئے ساری دُنیا کا اخلاقی نظام ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کے ماتحت کوئی فردِ بشر بھی خوراک اور کپڑوں سے محروم نہ رہنے پائے۔ دوسرے الفاظ میں ہر ایک شخص کو اس قدر کام مل سکے۔ کہ اس کا گذارہ چل سکے۔ اور یہ نظام صرف اسی حالت میں عالمگیر پیمانے پر مروج ہو سکتا ہے۔ جبکہ زندگی کی ابتدائی ضروریات کی پیدائش کا کام عوام کے ہاتھ میں ہو۔ یہ چیزیں سب کے لئے اسی طرح ہی مفت ہونی چاہئیں۔ جس طرح کہ خدا کی ہوا یا پانی ہیں یا ہونے چاہئیں۔ اور وہ کبھی دوسروں کی لوٹ کھسوٹ کے لئے ذریعہ تجارت نہیں چاہئیں۔ کسی ملک یا قوم یا جماعت یا اشخاص کا اجارہ دار ہونا خلاف انصاف ہے۔ اس اصول کی نظر اندازی ہی اس بے نوائی کی موجب ہے جسے ہم نہ صرف اس ناخوش سرزمین بلکہ دُنیا کے دیگر حصوں میں بھی دیکھ پاتے ہیں۔

ہم اپنی قومی طاقت کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات صرف پیداوار کے بہترین طریقوں کے استعمال کے ذریعے ہی نہیں۔ بلکہ پیداوار اور تقسیم دونوں کے بہترین طریق سے کی جا سکتی ہے۔

میرا آدرش مساوی تقسیم ہے۔ مگر میں جہاں تک دیکھتا ہوں۔ یہ صورت پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں یہ منصفانہ تقسیم کے لئے کام کر رہا ہوں۔

میں نے راستہ پا لیا ہے

میں تو صرف سچائی کا طالب ہوں۔ اور میں دعوے سے کہتا ہوں۔ کہ میں نے سچائی کا راستہ پا لیا ہے۔ اور میرا دعوےٰ ہے کہ میں نے اسے پانے کے لئے لگاتار کوشش کی ہے۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میں ابھی تک سچائی کو نہیں پا سکا۔ سچائی کو پورے طور پر جاننے کے معنی خود کو اور اپنی شدنی کو جاننا۔ دوسرے الفاظ میں مکمل ہونا ہے۔ میں اپنے نقائص کو درد کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ اور اسی احساس میں ہی میری اس طاقت کا جو مجھے حاصل ہے۔ راز مضمر ہے۔ کیونکہ انسان کے لئے اپنے نقائص کو جان لینا ایک نادر بات ہے۔

میری الروح اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ یہ ایک ناانصافی یا ایک مصیبت زدہ دیکھ رہی ہو۔ مگر مجھ جیسے کمزور، لاغر اور دکھی انسان کا ہر ایک بے انصافی کا تدارک کرنا یا ہر ایک قسم کی بے انصافی جو مجھے دکھائی دیتی ہے کے لئے

الزام سے خود کو بری خیال کرنا ممکن نہیں ہے۔ میری اندرونی روح مجھے ایک طرف کھینچتی ہے۔ اور میرا جسم اس کے متضاد پہلو میں کھینچتا ہے۔ ان دونوں طاقتوں کے عمل سے نجات پائی جا سکتی ہے۔ مگر یہ نجات آہستہ آہستہ اور پُر ضد مراحل میں سے گذرنے پر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں کام کرنے سے میکانکی طریق پر انکار کی بجائے صرف غیر جانبدارانہ طریق پر عاقلانہ عمل کے ذریعے ہی اسے حاصل کر سکتا ہوں۔ یہ جد و جہد جسم کے لگاتار سُولی پر چڑھائے جانے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تاکہ روح کامل طور پر نجات پا سکے۔

مجھے راستہ معلوم ہے یہ تلوار کی دھار کی مانند تنگ اور سکڑا ہوا ہے۔ میں اُس پہ چلنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ اور پھسل جانے پر روتا ہوں۔ بھگوان کہتے ہیں۔ جو شخص کوشش کرتا ہے۔ وہ کبھی تلف نہیں ہوتا۔ میں اس وعدہ میں بے حد یقین رکھتا ہوں۔ اس لئے اگر میں اپنی کمزوری کے باعث ہزار بار ناکامیاب رہوں۔ میں یقین کھو بیٹھنے کی بجائے یہ امید رکھونگا۔ کہ جب میرا جسم بالکل ہی میرے قابو میں آجائیگا۔ جیسا کہ کبھی ایسا ہونا ضروری ہے۔ میں روشنی کو دیکھ پا ؤنگا۔

میں مستقبل کو پہلے سے ہی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرا کام حال کی خبر گیری ہے۔ خدا نے مجھے اگلے لمحہ پر کوئی قابو نہیں بخشا۔ یہ بات درست ہے۔ کہ مجھے اکثر اوقات نیچا دکھلایا گیا ہے۔ بہتوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ اور بہت سے لوگ معیار پر پورا اترنے میں قاصر رہے ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ اپنے تعلقات کے باعث کبھی پچھتاتا نہیں۔ کیونکہ میں جس طرح تعاون کرنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح عدم تعاون کرنا بھی جانتا ہوں۔ دنیا میں جینے کا سب سے بڑھ کر عملی اور شاندار طریقہ لوگوں کے الفاظ پر بھروسہ کرنا ہے۔ تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی مثبت دلیل نہ پائی جائے۔

میں ایک غریب جد و جہد کرنے والی روح ہوں۔ جو بالکل ہی نیک، بالکل سچی

اندر خیال۔ لفظاً اور عمل میں بالکل ہی غیر متشدد رہنے کی آرزو رکھتی ہوئی اس معیار پر رسائی حاصل کرنے میں کبھی ناکامیاب نہیں ہوتی جسے میں سچا خیال کرتا ہوں۔ ہر ایک اگلے قدم میں خود کو قوی تر اور اس سے اگلے قدم کے لائق محسوس کرتا ہوں۔

میں نے کبھی پر اُمیدی کو نہیں چھوڑا۔ ظاہراً تاریک ترین اوقات میں میرے اندر چمکیلی امید پھوٹ اٹھتی ہے۔ میں امید کو مٹا دینے کی قابلیت نہیں رکھتا اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں اپنی امید کو درست ثابت کرنے کے لئے کوئی مرئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ مگر مجھ میں شکست وجود نہیں رکھتی۔

میں ساری دنیا کو خوش کرنے کی خاطر خدا سے کبھی غداری نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنی ساری شخصی اور پبلک زندگی کے دوران میں کبھی وعدہ شکنی نہیں کی۔

میں پوشیدہ طریقوں کو نہیں جانتا۔ اور نہ ہی سچائی کے سوا دہری چالوں کو جانتا ہوں۔ میرے پاس عدم تشدد کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے بے خبری میں گمراہ ہو سکتا ہوں۔ مگر ہمیشہ کے لئے نہیں۔

ضمنی اقوال

غذا

مَیں کہتا ہوں۔ کہ ابھی تک اہلِ سائنس نے بیشمار بیجوں، پتوں اور پھلوں کے متعلق اس امر کی کھوج ہی نہیں کی۔ کہ وہ نوعِ اِنسان کو کس قدر زیادہ سے زیادہ غذائیت دے سکتے ہیں۔ حیوانی خوراک میں عقیدت کے بارے میں جو عظیم اور مستقل مفاد لشیدو نما پا چکے ہیں۔ وہ اہلِ طبابت کو اس سوال پر مکمل غیر جانبداری کے ساتھ بحث کرنے میں مانع ہو رہے ہیں۔

اس قول میں عظیم سچائی پائی جاتی ہے۔ کہ اِنسان جو کچھ کھاتا ہے۔ وہی کچھ ہو جاتا ہے۔ خوراک جس قدر کثیف ہوگی۔ اس سے تیار ہونے والا جسم بھی اسی قدر کثیف ہوگا۔

یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اِنسان کو ماں کے دودھ کے سوا جو وہ بچپن میں چوستا

کرتا ہے اور کسی قسم کا دودھ پینے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اس کی خوراک صرف دھوپ سے پکے ہوئے پھلوں اور گریدار میووں سے ہی مشتمل ہونی چاہیئے۔ وہ انگور کی مانند پھلوں اور بادام کی مانند گری دار میووں سے پٹھوں اور نسیجوں کے لئے کافی غذا حاصل کر سکتا ہے۔ اس شخص کے لئے جو ایسی خوراک کے سہارے جیتا ہے۔ اس کے لئے شہوات اور دیگر جذباتِ نفسانی پر قابو پانا آسان ہوتا ہے۔

صحیح یا غلط طور پر یہ امر میرے مذہبی عقیدے کا ایک جزو ہو گیا ہے کہ انسان گوشت اور انڈے وغیرہ کے بغیر رہ سکتا ہے ہمارے وسائل زندگی کی بھی آخر کوئی حد ہونی چاہیئے۔ ہمیں زندگی کی خاطر بھی بعض امور کو عمل میں نہیں لانا چاہیئے۔

کسی آب و ہوا میں جہاں انسانی افراد عام طور پر جی سکتے ہیں اور کسی مرحلہ پر بھی میں گوشت خوری کو انسان کے لئے ضروری نہیں سمجھتا۔ میری رائے میں نوع انسان کے لئے گوشت کھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے حیوانی دنیا سے برتر ہستی رکھتے ہیں۔ تب اُن کی نقل کرنا غلطی ہے۔

حیاتین (وٹامن) اور دھوپ سے براہِ راست نہایت ضروری حیاتین حاصل کر سکنے کے بارہ میں نہایت تیزی سے نشو و نما پانے والی جو تفتیشات ہو رہی ہیں۔ وہ خوراک کے متعلق علم طب کے پیش کردہ مسلمہ اصولی مسائل اور عقائد میں انقلاب لانے کو ہیں۔

انسانی زندگی کو اس کے اعلےٰ ترین مرتبہ پر سہارا دینے کے لئے نباتی دُنیا کو جو غیر محدود قابلیت حاصل ہے۔ اس کے بارہ میں ابھی تک علم طب نے جو اپنی عادت سے مجبور ہو کر مذبحوں (بوچڑ خانوں) یا زیادہ سے زیادہ دودھ اور اس کی پیداوار میں یقین رکھتا ہے۔ کھوج ہی نہیں کی۔ یہ ایک فرض ہے۔ جو اُن ممتاز ماہرین طب سے اپنی ادائیگی کا منتظر ہے۔ جو نباتات خوری کے حامی ہیں۔

اس میں ذرا شک نہیں ہے۔ کہ گوشت خوری سے پرہیز روحانی ارتقا میں بہت معاون ہوتا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح سے مقصد نہیں کہلا سکتا۔ کئی اشخاص دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو گوشت کھاتے ہیں۔ مگر وہ خدا سے سدا خائف رہنے کے باعث اس شخص کی بہ نسبت نجات کے نزدیک تر ہیں۔ جو دھرم کے نام گوشت خوری اور کئی اشیاء سے پرہیز کرتا ہوا اپنے ہر ایک عمل سے خدا کی توہین کرتا ہے۔

اپنی جبلت اور تربیت کی وجہ سے میں شخصی طور پر بالکل ہی نباتات خوری کے حق میں ہوں۔ اور سالوں سے ہی نباتی خوراک کے موزوں مرکبات کو دریافت کرنے کے لئے تجربے کر رہا ہوں۔ مگر میری طرف سے دودھ کی مذمت کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ دودھ کے بغیر خوراک کے حق میں مجھے زبردست شہادت حاصل نہ ہو جائے یہ بات میری زندگی کی کئی بے اصولیوں میں سے ایک ہے۔ کہ جبکہ میں شخصی طور پر دودھ لینے سے پرہیز کرتا ہوں۔ میں ایک ایسے نمونے کے شیر خانے کو چلا رہا ہوں۔ جو اس قسم کا گائے کا دودھ مہیا کر رہا ہے۔ جو اپنے خلوص اور غذائیت کے لحاظ سے ہندوستان کے کسی بھی اس قسم کا دودھ مہیا کرنے والے شیر خانے کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔

انسان کیلئے حلق کی لذت کی خاطر کھانے کی بجائے صرف اس لئے کھانا چاہیئے۔ کہ اس کا جسم قائم رہ سکے۔ جب جسم کا ہر عضو جسم کی خدمت کرتا ہوا اس کی راہ سے روح کی خدمت کیا کرتا ہے۔ تب اس کا مخصوص مزہ جاتا رہتا ہے۔ اور تب ہی یہ فطرت کے منشا کے مطابق اپنا کام کر سکتا ہے۔ اس بارہ میں جتنے بھی تجربے کئے جائیں تھوڑے ہیں۔ اور فطرت کے ساتھ اس مطابقت کو حاصل کرنے میں کوئی ایثار بھی حد سے زیادہ تصور نہیں ہو سکتا۔

علمِ طب

میں مغربی طبابت کے خلاف کہہ چکا ہوں۔ میں اسے کالے جادو کا سمٹا ہوا نچوڑ خیال کرتا ہوں۔ میرا یہ نظریہ میرے عدم تشدد کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ میری روح جراحی کے خلاف بغاوت کرتی ہے ...... میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں جس ظلم کو اپنے لئے منظور نہیں کرتا اسے ادنیٰ حیوانات کے لئے کیوں منظور کروں؟ مگر میں ہر ایک قسم کے طبی علاج کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم محفوظ زچگی اور ننھے بچوں کی خبرگیری کے لئے مغرب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے بچے کسی نہ کسی طرح سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ہماری اکثر عورتیں بچوں کی پرورش کے علم سے بے بہرہ ہیں۔ اس بارہ میں ہم مغرب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

لیکن مغرب انسانی زندگی کو طوالت دینے کو حد سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ زمین پر انسان کے آخری دم تک تم اس کے جسم میں پچکاری سے دوائیں بھرتے جاتے ہو۔ یہ بات ان کی اس بے پروائی کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی جو وہ میدان جنگ میں اپنی جانیں ایثار کرنے میں ظاہر کیا کرتے ہیں۔

اطبا (ڈاکٹرز)

یہ ایک سچی بات ہے کہ ڈاکٹر لوگ ہمیں اپنی خواہشات پورا کرنے کی ترغیب دیا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود ضبطی سے محروم ہو کر نفس پرست اور نامرد ہو رہے ہیں۔

پیشہ طبابت کے ساتھ میرا اہم جھگڑا اسی بات پر ہے کہ یہ روح کو بالکل نظر انداز کرتا ہوا جسم کی مانند ایک کمزور سے اوزار کی مرمت میں مصروف رہنے کے سوا اور کوئی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ اس طرح روح سے غافل رہ کر یہ پیشہ لوگوں کو اپنے رحم پر چھوڑتا ہوا انسانی شان اور خود ضبطی کو گھٹانے کا اثر رکھتا ہے۔ میں شکریہ کے ساتھ اس امر کو دیکھ رہا ہوں کہ مغرب میں ایک ایسا نظام تفکر بالتدریج مگر یقینی طور پر عروج پذیر ہونے لگا ہے۔ جو ایک مریض جسم کا علاج کرتے وقت روح کو بھی ملحوظ رکھتا ہوا اس وجہ سے ادویات کا کمتر اور ایک زبردست شافی ذریعے کے طور پر فطرت کا بیشتر سہارا لیتا ہے۔

جسم کو الشعور کے مندر کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے ہم اسے اپنی لطف اندوزیوں اور عیشوں کی خاطر برتنے میں لگ رہے ہیں۔ اور ان کی ایذادی کی کوشش اور اس طرح اس خاکی جسم کے ناجائز استعمال کے لئے ڈاکٹروں کے پیچھے دوڑتے رہنے سے ذرا نہیں شرماتے۔

ہمیں جسموں کی بجائے روحوں کے معالج درکار ہیں۔ شفا خانوں اور ڈاکٹروں کی کثرت سچی تہذیب کی علامت نہیں ہے۔ ہم اپنے جسموں کی نازبرداری کو جس قدر گھٹائیں۔ اسی قدر ہی ہماری اور دُنیا کی بھلائی ہوگی۔

میرا یقین ہے کہ انسان کو ادویات کی بہت کم ضرورت ہے۔ ہزار میں ۹۹۹ مریض تو باقاعدہ غذا۔ پانی اور مٹی کے طریقِ علاج اور گھریلو دواؤں سے ہی شفایاب ہو جایا کرتے ہیں۔

وُکلا

میں عمر بھر اپنی وکالت میں کبھی سچائی اور دیانتداری سے اِدھر اُدھر نہیں ہُوا۔ وکیل کا فرض یہی ہے۔ کہ وہ ججوں کے رُوبرو سچائی پیش کرے اور سچائی پر رسائی حاصل کرنے میں ان کی مدد کرتا ہُوا مجرم کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے کبھی کوشش نہ کرے۔

خوشی

خوشی سے مراد روشن ضمیرانہ طریق سے انسانی شان و عظمت کو حاصل کرنا اور انسانی آزادی کے لئے اس تمنا سے بہرہ ور ہونا ہے۔ جو صرف شخصی راحتوں کے حصول اور مادی ضرورتوں کے پورا کرنے میں تسلی نہ پاتی ہوئی حفظِ نفس کے لئے انہیں فوراً اور خوشی خوشی قربان کر دیتی ہے۔ یہ ہر فردِ بشر کے اندر اور کمال اور حقیقت کی کھوج میں بود و باش رکھتی ہے۔ کیا سب لوگ کمال کی جستجو کے اہل ہوتے ہیں جبکہ وہ اسے اپنی ذات میں ہی رکھتے ہیں۔

تعلیم

میں بچے میں اس کے ہاتھوں اس کے دماغ اور اس کی روح کو نشو و نما دوں گا۔ ہاتھ تقریباً سوکھ گئے ہیں۔ اور روح کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

میں علوم مختلفہ کی تعلیم کو قابلِ قدر خیال کرتا ہوں۔ ہمارے بچے جس قدر بھی علم کیمیا اور طبعیات کو سیکھ سکیں۔ اسی قدر ہی اچھا ہوگا۔

میرے منصوبہ اشیاء کی رو سے ہاتھ کو نقشہ کشی اور عکس اتارنے سے پہلے ہتھیاروں کو استعمال کرنا ہوگا۔ آنکھیں اسی طرح ہی حروف و الفاظ کا مطالعہ کریں گی۔ جس طرح کہ وہ زندگی کی دیگر اشیاء کا علم حاصل کرتی ہیں۔ اور کان اشیاء اور فقرات کے ناموں اور ناموں کو گرفت کرنے لگیں گے۔ ساری تربیت فطرتی ذریعہ سے

اور سریع ترین اور سہل ترین ہوگی۔

آنکھوں۔ کانوں اور زبان کا کام ہاتھ سے پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ مطالعہ لکھنے اور نقشہ کشی اور حروف تہجی کا خاکہ اُتارنے سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اگر اس فطری طریق کی پیروی کی جائے۔ تب بچوں کی عقل و فہم اُس حالت کی نسبت نشو و نما کا زیادہ موقع پائے گی۔ جبکہ بچوں کی تعلیم کو حروف تہجی سے شروع کر کے اسے دبا کر رکھا گیا ہو۔

موت

کئی سالوں سے میں اس عقیدہ کا عقلی طور پر قائل چلا آیا ہوں۔ کہ موت زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور اس لئے یہ جب بھی آئے اسے خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے دل سے ہر قسم کے خوف کو جسمیں خوفِ مرگ بھی شامل ہے۔ نکالنے کی عظیم کوشش کی ہے۔ تو بھی مجھے ایسے مواقع یاد ہیں۔ جبکہ میں قریب موت کے خیال پر وہ خوشی محسوس نہیں کر سکا جو کہ مدتوں سے کھوئے ہوئے دوست کی ملاقات پر حاصل ہوا کرتی ہے۔ اس طرح انسان طاقتور ہونے کے لئے کوششوں کے باوجود بھی کمزور رہ جاتا ہے۔ اور وہ علم جو دماغ پر ہی ٹھہر کر دل میں سرائیت نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے نازک لمحات میں کار آمد نہیں ہو سکتا۔ نیز اس حالت میں روحانی قوت جاتی رہتی ہے۔ جب کہ انسان خود سے باہر کسی شے کا سہارا لے کر اس سے طالب امداد ہوتا ہے۔ ایک ستیاگرہی کو ایسی ترغیبات کے موقعوں پر سدا چوکس رہنا واجب ہے۔

اگر کوئی شخص مجھے موت سے بچنے کے لئے یہ مشورہ دے۔ کہ میں اس سال کے ختم ہونے تک ہمالہ میں گوشہ نشین ہو رہوں۔ تو مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ میں

جانتا ہوں۔ کہ موت اٹل ہے۔ خواہ انسان کتنی ہی پیش بندیوں سے خود کو دھوکہ دینے کی کوشش کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بات کو جان جائیں۔ کہ ہندوستان میں میں ان معدودے لوگوں میں سے ہوں۔ جو اس بات کو جانتے ہیں کہ کس طرح صحت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات خدا کو ہی معلوم ہے کہ اس نے مجھ سے کیا کام لینا ہے۔ اور جب اسے میرے کام کی ضرورت نہ رہے گی۔ تو وہ اس سے آگے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی جینے کی اجازت نہ دیگا۔

شراب نوشی

شراب نوشی کو ایک بدی کی بجائے ایک بیماری سمجھنا درست تر ہے۔ میں بیسیوں اشخاص کو جانتا ہوں۔ جو اگر شراب نوشی کو ترک کر سکیں۔ تو وہ اسے خوشی سے ترک کرنے کو تیار ہیں۔ بعض نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ ان سے شراب کو دور رکھا جائے۔ اور جب اس تجویز پر عمل کیا گیا ہے۔ تو انہوں نے شراب چرا کر پینے سے دریغ نہیں کیا۔ بعض لوگوں کی ان کے رجحان کے خلاف مدد کرنی چاہیئے۔

روح کا غیر فانی ہونا!

میرا یقین ہے کہ ایک صحیح روح کو صحیح جسم میں بسنا چاہیئے۔ اس لئے روح جس قدر صحت اور جذبات نفسانی سے آزادی میں نمو پذیر ہوتی ہے۔ اسی قدر جسم بھی اسی حالت میں نشو و نما پاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک صحیح جسم لازمی طور پر گوشت کے لحاظ سے مضبوط ہوا کرتا ہے۔ اکثر اوقات ایک بہادر

روح ایک لاغر جسم میں پائی جاتی ہے۔ ایک مرحلہ کے بعد جس قدر روح بڑھتی ہے اس قدر گوشت گھٹتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کامل طور پر صحیح جسم بہت ہی دبلا پتلا ہو۔ ایک عضلاتی جسم بسا اوقات بہت سی بیماریوں کا وارث ہوا کرتا ہے۔ اگر وہ ظاہری طور پہ بیماری سے محفوظ بھی ہو۔ تو بھی وہ تعدیات اور چھوت وغیرہ سے محفوظ نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے ایک پورے طور پر صحیح جسم پر ان چیزوں کا مطلقاً اثر نہیں ہوتا۔ ناقابلِ فساد خون کل تعدیات سے بچے رہنے کی اندرونی خوبی سے بہرہ ور ہوا کرتا ہے۔

ایسے توازن کا حصول سچ مچ بہت مشکل امر ہے۔ ورنہ میں اسے حاصل کر لیتا۔ کیونکہ میری روح اس امر کی شاہد ہے کہ میں اس حالتِ کاملہ کو حاصل کرنے کے لئے ہر ایک قسم کلوہ مد برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی بھی بیرونی مشکل میرے اور اس حالت کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی۔ مگر پچھلے سنسکاروں اور تاثرات کو مٹانا کم از کم میرے لئے تو آسان بات نہیں ہے۔ مگر یہ تاخیر مجھ میں ذرا بھی مرجھاوٹ کی موجب نہیں ہو سکی۔ کیونکہ میں اس حالت کی ایک ذہنی تصویر سے بہرہ ور ہوں۔ اور اس کی دھندلی جھلک بھی پا چکا ہوں۔ میں نے جس قدر ترقی کی ہے۔ وہ مجھے مایوس کرنے کی بجائے امید سے بھرنے کا اثر رکھتی ہے۔ لیکن اگر اس حالت کے حصول سے پیشتر مجھے جسم چھوڑنا پڑے۔ میں یہ خیال نہیں کرونگا کہ میں ناکامیاب رہا ہوں۔ کیونکہ میں دوبارہ جنم میں اسی طرح ہی کوئی شک نہیں رکھتا جس طرح کہ موجودہ جسم کے ہونے میں۔ اس لئے میں جانتا ہوں۔ کہ ذرا سی کوشش بھی رائیگاں نہیں جا سکتی۔

میں روح کے غیر فانی ہونے کا قائل ہوں۔ میں آپ کے روبرو سمندر کی مثال پیش کروں گا۔ سمندر پانی کے قطروں سے مرکب ہوتا ہے۔ ہر ایک قطرہ

جداگانہ ہستی رکھتا ہوا بھی کُل کا جزو ہوتا ہے۔ اس میں ایک اور انیک دونوں ہی پائے جاتے ہیں۔ اس بحرِ زندگی میں ہم سب کے سب ننھے قطرے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ تقاضا کرتا ہے کہ میں خود کو زندگی اور ہر ایک زندہ شئے کے ساتھ ایک سمجھوں اور میں خدا کی حضوری میں زندگی کے دُکھ کا حصہ دار ہوں۔ اس زندگی کی میزانِ کل کا نام ہی تو خدا ہے۔

رازداری

میں رازداری کو گناہ سمجھنے لگا ہوں۔ اگر ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر اسے اپنے ہر قول و فعل کا شاہد یقین کریں۔ تب ہم اس زمین پر کسی شخص سے بھی کوئی بات چھپا نہ رکھیں گے۔ کیونکہ ہم اپنے خالق کے روبرو ناپاک خیالات نہ سوچ سکیں گے۔ ان کا اظہار تو درکنار رہا۔ یہ ہماری ناپاکی ہے۔ جو رازداری اور تاریکی ڈھونڈا کرتی ہے۔ انسانی فطرت غلاظت کو چھپانے کا میلان رکھتی ہے۔ ہم غلیظ اور گندی چیزوں کو دیکھنا اور چھونا پسند نہیں کرتے۔ ہم انہیں اپنی نظر سے اوجھل رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی حال ہماری تقریر کا ہے۔ میں یہ سجھاؤ پیش کرونگا کہ ہمیں تو ایسے خیالات کا سوچنا بھی ترک کر دینا چاہیئے۔ جو ہم دنیا سے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

G. Kr... 10/5/96